وجاہت علی سندیلوی

شائع کردہ

ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

بار اول ——— ۱۹۶۴ء

قیمت ——— چار روپیہ پچاس نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر ۲۶۱۳۵

مطبوعہ

سرفراز قومی پریس، لکھنؤ

نقارہ کیا حریف ہوا اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

نشاطِ غالب

مصنفہ
وجاہت علی، سندیلوی

نشاطِ غالب

مرزا غالب کے قریب ساٹھ ایسے اشعار ہیں جن کے متعلق اُن کے مختلف شارحین کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے یا جن کے متعلق بعض حضرات نے یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ پیش رو شعرا کے بعض اشعار کی عکاسی کرتے ہیں، شارحین اور معترضین کے اقوال کی روشنی میں بحث و تبصرہ ۔ ساتھ ہی ساتھ غالب کے غیر متداول کلام کے چند اشعار کی، جو عام طور سے دیگر شرحوں میں نہیں پائے جاتے ہیں شرح بھی پیش کی گئی ہے۔ آخر میں غالب کے متداول اور غیر متداول کلام کا ایک مختصر انتخاب بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔

پیدائش ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء　　مرزا غالب　　وفات ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء

مرزا غالب کی مستند تصویر

یادش بخیر غالب اکادمی بنارس کے صدر مولانا خیر بہوروی
مرزا غالب کی تصاویر کے باب میں سند کی حیثیت رکھتے ہیں اور
بلاخوف تردید میرے معذرت کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مستند ہے ان کا فرمایا ہوا
موصوف نے مرزا غالب کی تمام مستند اور غیر مستند تصویروں کو تاریخی
اور تحقیقی اشاروں کے ساتھ "مرقع غالب" میں شائع کر دیا ہے یہ تصویر
جس کی اشاعت کا فخر ادارہ فروغ اردو لکھنؤ حاصل کر رہا ہے
مرزا غالب کے اس فوٹو سے بنائی گئی ہے جو ان کا پہلا اور آخری
فوٹو ہے اور عطیہ ہے مولانا خیر بہوروی کا ان کا بیان ہے کہ یہ فوٹو
نواب مرزا علاء الدین خاں علائی مرحوم نے غالب کی وفات سے
چھ مہینے پہلے کھنچوایا تھا، فوٹوگرافر ایک انگریز تھا جس کی دوکان شملہ
میں تھی اور وہ زیادہ تر نوابین اور راجگان کے فوٹو کھینچتا تھا مولانا
خیر بہوروی میرے اور غالب کے قدرشناسوں کی طرف سے شکریہ
مستحق ہیں جنھوں نے اصل فوٹو سے بلاک بنانے اور شائع کرنے کی
اجازت مرحمت فرمائی

محمد حسین شمس علوی
ادارہ فروغ اردو لکھنؤ

۱۵ مئی ۱۹۶۴ء

مُحبّت اور خُلوص کے ساتھ

اپنے بھائی، رفیق، اور قدرداں

سیّد اسرار مسعود صاحب

کے نام

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں
تیرے سوا بھی مجھ پہ بہت سے ستم ہوئے

فہرست

نمبر شمار	ترتیب	صفحہ

نمبر شمار	ترتیب	صفحہ
(۱۱)	ذرّہ ذرّہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے۔	
(۱۲)	کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔	
(۱۳)	پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟	
(۱۴)	ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب؟	
(۱۵)	اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے۔	
(۱۶)	طاؤس در رکاب ہے، ہر ذرّہ آہ کا۔	
	(ب)	
(۱۷)	ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کار اسدؔ۔	
	(ج)	
(۱۸)	ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار۔	
	(د)	
(۱۹)	کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق؟	
	(ر)	
(۲۰)	چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا۔	

نمبر شمار	ترتیب	صفحہ
(۲۱)	لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہر درخشاں پر۔	
(۲۲)	یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات !	
(۲۳)	ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں۔	
	(ز)	
(۲۴)	تو اور آرائشِ خمِ کاکل۔	
	(م)	
(۲۵)	تماشائے گلشن، تمنائے چیدن۔	
	(ن)	
(۲۶)	سلطنت دست بدست آئی ہے۔	
(۲۷)	آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز۔	
(۲۸)	خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار۔	
(۲۹)	نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں۔	
(۳۰)	ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے۔	
(۳۱)	پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ۔	
(۳۲)	دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا۔	

نمبر شمار	ترتیب	صفحہ

صفحہ	ترتیب	نمبر شمار
	ننگِ معمارِ حسرت تھا چہ آبادی چہ ویرانی ۔	(۴۷)
	دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں ؟	(۴۸)
	طاؤسِ خاکِ حسنِ نظر باز ہے مجھے ۔	(۴۹)
	وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر ۔	(۵۰)
	گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے ۔	(۵۱)
	فسردگی میں ہے فریادِ بے دلاں تجھ سے ۔	(۵۲)
	پری بہ شیشہ و عکسِ رخ اندر آئینہ ۔	(۵۳)
	بہار حسرتِ نظارہ سخت جانی ہے ۔	(۵۴)
	طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سو ۔	(۵۵)
	چمن چمن گلِ آئینہ در کنار ہوس ۔	(۵۶)
	نیاز پردۂ اظہار خود پرستی ہے ۔	(۵۷)
	بہانہ جوئیِ رحمت، کمیں گرِ تقریب ۔	(۵۸)
	اسد بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس ۔	(۵۹)
	انتخاب کلام غالب	(۶۰)
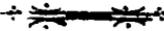
پیش لفظ

کیا فارسی، کیا اُردو، کیا نثر، کیا نظم؟ غالب کی طرف سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ؎

ہزار معنی، سر جوشِ خاصِ نطقِ من است
کز اہلِ ذوق دل و گوشے از عمل بردست

فارسی سے انھیں خاص مناسبت اور فطری لگاؤ تھا اور اس کے رموز و نکات ان کے ذہن میں ایسے رچے ہوئے تھے جیسے بقولِ خود "فولاد میں جوہر"۔ انھیں فارسی میں قادر الکلامی اور جولانیِ طبع دکھانے کا جو میدان میسّر تھا وہ اُردو میں ہرگز نہیں تھا۔ لیکن اب فارسی میں انھیں سمجھنے اور داد سخن دینے والے ہمارے درمیان کہاں؟ بس یوں سمجھ لیجیے کہ جب خود اُردو کے، جس نے اسی دیش میں جنم لیا، یہیں پلی، بڑھی، پروان چڑھی، اور یہیں جوان ہونے پر جس نے اپنی گُل فشانیِ گفتار، سے ہر چھوٹے بڑے کا دل موہ لیا، اور جو نہ صرف ایک جیتی جاگتی دل آویز زبان بلکہ بذاتِ خود ایک ایسی تہذیب بھی ہے کہ جس کے قومی یک جہتی کے سنگم پر کوثر اور گنگا کے دھارے شیر و شکر ہو کر ملتے ہیں، ہمارے ملک میں پڑھنے والے اور جاننے والے کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، تو پھر فارسی کا ذکر ہی کیا؟ لہٰذا بصورتِ موجودہ غالب کے فارسی میں وہ

"نقشہائے رنگ رنگ"، جن میں اُنھوں نے اپنے خونِ جگر سے رنگ آمیزی کی تھی، ہماری نظروں سے قریب قریب اوجھل ہیں اور ہم غالبؔ کی صحیح ادبی حیثیت متعین کرنے سے بڑی حد تک قاصر ہیں۔

● اُردو میں لے دے کر غالبؔ کا ایک بہت مختصر متداول دیوان ہے اور کچھ نجی خطوط، جو اُنھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو قلم برداشتہ لکھے تھے اور جن کو لکھتے وقت ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اشاعت کی بھی کبھی نوبت آسکتی ہے۔

اپنے اُردو کلام کے متعلق غالبؔ نے ذوقؔ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

اور اپنے نجی خطوط کے متعلق ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان کی اشاعت سے میرے "شکوہِ سخنوری" کو صدمہ پہونچ جانے کا احتمال ہے، ان خطوط کی نقلیں اپنے پاس رکھنے کا انھیں کبھی خیال ہی نہیں پیدا ہوا اور ان کا بہت بڑا حصّہ خود غالبؔ کی زندگی میں تلف بھی ہو چکا تھا۔

لیکن یہی بچا کھچا مالِ غنیمت جو اُردو کے ہاتھ لگا، اس کے لیے ہفت اقلیم کے خزانوں سے کم گراں قدر ثابت نہیں ہوا۔ بے رنگ مجموعۂ اُردو، ساری فضا کو رنگینیوں سے معمور کر کے اُردو شاعری کے چمن پر ایک بہارِ بے خزاں بن کر چھا گیا۔ کوئی ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے

اس قول میں کہ "ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوانِ غالب" ان کا ہم نوا ہو یا نہ ہو یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ دیوانِ غالب سے زیادہ عہد آفریں صحیفہ کم سے کم اُردو میں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ غالب کے بعد آنے والی نسلوں کو اس نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جتنا اس مقابلۃً مختصر دیوان پر لکھا گیا ہے اتنا اُردو کی کسی دوسری کتاب پر نہیں بلکہ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ اُردو کے تمام غزل گو شعرا پر مجموعی طور سے بھی اس قدر کتابیں اور مضامین نہیں ملتے ہیں جس قدر کہ تنہا غالب پر۔ غالب کے بعد اگر کسی شاعر پر لکھا گیا ہے تو علامہ اقبال پر جو ایک مبلغ اور بامقصد شاعر تھے، لیکن طرزِ بیان کی حیرت انگیز مماثلت کے باوجود دونوں کی شاعری کے میدان بہت مختلف تھے۔

اور غالب کے انھیں نجی خطوط نے جنھیں وہ کبھی اپنے شکوہِ سخنوری کے منافی سمجھتے ایک ایسے طرزِ نگارش کی بنیاد رکھی کہ جس سے اُردو نثر جدید کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ ان خطوط نے اُردو نثر کو بے جا تصنع اور تکلّف، فارسی کی نقل اور پُرپیچ عبارت آرائی کے طلسم سے آزاد کر کے طوطا مینا، جن اور پری، شہزادوں اور درویشوں کی زبان کے بجائے ہم عام انسانوں کے بولنے اور لکھنے کی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمت انجام دی۔ ہے اُس کے پیشِ نظر نقادانِ ادب کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ شاعر غالب بڑا ہے یا انشاپرداز غالب۔ مزاح اور بے تکلفی کی چاشنی میں

ڈوبے ہوئے اپنی بے ساختگی، لطفِ بیان اور خلوص اظہار کے لئے یہ خطوط اب بھی یکتا اور بے مثال سمجھے جاتے ہیں اور بڑے بڑے صاحب طرز اور سحر نگار ادیب اور انشا پرداز، ان کے طرز کی نقل کرنا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے رہے ہیں۔ اُردو نظم و نثر کا کوئی انتخاب اُٹھا کر ملاحظہ کر لیجئے صرف غالب ہی ایک ایسا شاعر اور ادیب ہے، جو دونوں اصناف سخن میں ایک ہی شان سے صفِ اول میں جلوہ گر نظر آئے گا۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ شاعر اور نثر نگار کی مجموعی حیثیت سے غالب اُردو ادب کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔

غالب کی عظمت اور اس کی بنا پر اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی بُنیاد صرف اس پر نہیں ہے کہ اس نے ہمارے لئے بہت سے ادبی جواہر پارے چھوڑے ہیں یا اس نے تخیل کی نادرہ کاری، جذبات کی شدت، نظر کی گہرائی، مشاہدے کی جدت، افکار کی بلندی اور ساتھ ہی ساتھ طرز ادا کی ندرت اور حسنِ بیان کی لطافت کے بہت اعلیٰ اور ارفع شاہکار پیش کئے ہیں بلکہ غالب کے غالب بننے کا اصلی راز یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد میں آنے والی نسلوں کو ایک نیا اندازِ فکر، ایک جدید رجحان اور ایک ترقی پسند شعور بخشا ہے۔ غالب شاہراہِ ادب کا ایک سنگ میل نہیں جو صرف کسی مخصوص منزل کی نشان دہی کرتا ہے بلکہ روشنی کا ایک مینارہ ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے مختلف سمتوں کے راستوں کو منور کرتا ہے وہ نہ خود کوئی منزل ہے نہ کسی منزل کا اشارہ بردار لیکن اس کی روشنی سے

اس کے پاس سے گزرنے والے فیضیاب ضرور ہوتے ہیں۔ اقبالؔ اور جوشؔ کے راستے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، لیکن دونوں ہی غالبؔ سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ اور اسی طرح دَورِ جدید کے بہت سے مشہور اور مقبول عام شعرا کے کلام میں غالبؔ کا بڑا چوکھا رنگ نظر آتا ہے۔

غالبؔ ہمیں ہر بات کو عام دیکھنے والوں سے ہٹ کر ایک جداگانہ زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت کا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف آسمان کے تارے چھو لینے کے لیے اکساتا ہے تو دوسری طرف زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے رہنے کی بھی تلقین کرتا ہے روایت کی پابندی میں اُس کے یہاں بھی غمِ جاناں کا بڑا رونا ہے لیکن وہ اس سیلاب میں بہ نہیں جاتا۔ اس کا غمِ جاناں، غمِ دَوراں کا صرف ایک جزو ہے۔ اس کی زندگی ایک جبرِ مشیت اور غمِ لازوال ہے، لیکن وہ اس سے بھی لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شبِ غم تاریک سے تاریک تر ہے لیکن وہ اس کے 'خندہ دل' اور 'نشاطِ تصوّر' کے چراغوں کے درمیان اپنا دامن سمیٹتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ مذہب کے قیود اور رسوم سے وہ متنفر ہے۔ واعظ اور زاہد سے اُس کی چشمکیں لڑائی ہے۔ ساری کائنات میں وہ صرف ایک ذاتِ گرامی کا جلوہ دیکھتا ہے، مگر اُس کے حضور میں بھی وہ تشکیک، طنز اور شوخی سے باز نہیں آتا۔ وہ بیک وقت بت تراش بھی ہے اور بت شکن بھی۔ وہ روایتی شاعری کی بڑی دیدہ زیب قبا پہن کر سامنے آتا ہے لیکن اگر ہم قریب سے دیکھیں تو اُس کی

آزاد خیالی کے ہاتھوں اس کے جسم پر یہ قبا جگہ جگہ سے چاک بھی نظر آتی ہے وہ زندگی ہی کی طرح سیدھا بھی ہے اور پُر پیچ بھی، قدامت پرست بھی ہے اور انقلاب پسند بھی۔ غیر ضروری طور سے سنجیدہ بھی ہے اور ضرورت سے زیادہ شوخ بھی۔ بے مقصد بھی ہے اور خود ہی اپنا مقصد بھی۔ اس کی بذلہ سنجی اور مزاح کا لطیف حس جو اسے دوسروں پر کیا خود اپنے آپ پر ہنسنے اور مُنھ چڑھانے پر مجبور کر دیتا ہے، ہمیں کارزار حیات میں خود اعتمادی اور بالغ نظری کا ایک نیا احساس اور ولولہ عطا کرتا ہے۔ اور پھر اس پر طُرّہ یہ کہ اس کا انداز بیان ایسا دل فریب اور پُر کشش ہے کہ اس کے مُنھ سے نکلی ہوئی معمولی سے معمولی بات پایۂ سحر و اعجاز کو پہونچ جاتی ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
مَیں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کی تعریف اور توصیف کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان کا کلام غلطیوں سے بالکل مُبرّا ہے یا اُنھوں نے پست اشعار نہیں کہے ہیں یا انھوں نے تمام ممکن موضوعات سخن کو اپنا لیا تھا، یا اُنھوں نے جس مضمون پر شعر کہا ہے سب شعرا سے بہتر کہا ہے، یا انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے اور اس سے بہتر نہ کہا گیا ہے نہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسا خیال بھی کرنا نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہوگا۔ عقیدت مندی کے جوش میں حقیقت پسندی کا ہوش ضرور باقی

رہنا چاہیئے۔ خواہ وہ غالب ہو یا کوئی بھی دوسرا شاعر، اس کے مرتبے کے تعین کے لیئے پہلے اس کے بہترین کلام کو پیش نظر رکھنا چاہیئے، اور پھر یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس کے بلند پایہ، اوسط درجے اور پست قسم کے کلام کا تناسب کیا ہے۔ غالب کے کلام کا معتد بہ حصہ بلند پایہ ہے۔ اوسط درجے کا کلام اس سے کچھ ہی زیادہ ہوگا اور پست قسم کا کلام کم بلکہ بہت ہی کم ہے حتٰی کہ دو تین فی صدی بھی نہیں ہوگا۔ اور اس معیار پر غالب اور اقبال کے علاوہ بہت ہی کم دوسرے شعرا پورے اُتر سکیں گے۔

غالب کے کلام کو تین مفروضہ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں اُن کی بے دلانہ شاعری ہے۔ یہ نہ صرف فارسی ترکیبات سے گراں بار ہے بلکہ معنوی حیثیت سے بھی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ یہ دل کی نہیں دماغ کی شاعری ہے۔ اس میں قادر الکلامی اور پرواز تخیل زیادہ اور لطف اور بے ساختگی کم ہے۔ یہ ان کی نو عمری کی تجرباتی شاعری تھی۔ اس سے ان کی منفرد طبیعت، غیر معمولی ذہانت اور قدرت اظہار کی فراوانی کا صاف پتہ چلتا ہے اور اس میں بھی صنعت ایجاد، جوش نگاہ، نشاط تصور کی وہ سرشاریاں اور کرشمہ سازیاں کار فرما نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ چونکہ اُردو کی مروجہ شاعری سے اس کا پیوند نہیں ملتا تھا لہذا غالب نے خود اس کلام کا بہت بڑا حصہ قلم زد کر کے اپنے متداول دیوان میں شامل نہیں کیا تھا۔

ان کے کلام کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انھوں نے اپنے زمانے کے روایتی

موضوعاتِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے ۔ یہ اُن کے کلام کا سب سے بڑا حصہ ہے اور اسے ہم صرف اوسط درجے کی اچھی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ شاعری کی پامال شاہ راہوں میں بھی اپنے منفرد زاویۂ نگاہ اور اندازِ بیان سے اُنھوں نے اپنے علیحدہ راستے نکالنے کی کوششیں کی ہیں، تاہم یہ اُن کی بہترین شاعری نہیں ہے ۔ یہ اُن کی جدت طرازی، ذاتی اُپج اور فطری اُمنگ سے کچھ زیادہ میل نہیں کھاتی ہے۔ اسی کلام میں ایک بہت قلیل جزو ایسا بھی ہے جو دوسروں کے لیے قابل قبول ہو تو ہو غالب کے شایانِ شان نظر نہیں آتا، لہذا ہم اس کو ان کا پست کلام کہہ سکتے ہیں خوش قسمتی سے اس کی مقدار بہت حقیر ہے ۔ اپنے اوسط درجے کے کلام میں بھی غالب کی انفرادیت بحیثیت شاعر اس کی شخصیت کا خلوص اور اختراع پسندی صاف جھلکتی نظر آتی ہے ۔

ان کے کلام کی تیسری قسم وہ ہے جس میں مضامین کی ندرت تخیل کی ہمہ گیری، مزاح کی بے ساختگی، زبان کی لطافت اور بیان کی حلاوت میں وہ انتہائی کمال پر نظر آتے ہیں۔ اس کلام پر خود ان کا قول ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

حرف بحرف صادق آتا ہے ۔ یہاں خواہ مسائل تصوف ہوں، خواہ رموزِ حیات، خواہ معاملہ بندی، خواہ حسن و عشق کی پرانی چھیڑ چھاڑ خواہ وصل ہو، خواہ فراق، خواہ غمِ روزگار رہے خواہ نشاطِ زندگی

خواہ مشاہدات ہوں خواہ محسوسات اور خواہ صرف طرز ادا اور لطف اظہار ہو غالب بے کراں اور بے پناہ نظر آتے ہیں۔ ایک ایک شعر پر کیا ایک ایک لفظ پر اُن کی مُہر ثبت ہے۔ بسلّم الثبوت اساتذہ کے بیسیوں اشعار میں ان کا ایک شعر رکھ دیجیے اُس کی شان نرالی دکھائی پڑے گی اور وہ خود بُول اُٹھے گا کہ میں غالب کے ذہن رسا کی پیداوار ہوں ۔ اسی کلام نے غالب کو غالب بنایا ہے۔ اور یہ صرف اُردو شاعری میں کیا دنیا ئے شاعری میں بلند سے بلند مقام پانے کا مستحق ہے۔ اور اسی کے لئے انھوں نے بالکل بجا طور سے کہا ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

میرا مستقل پیشہ وکالت ہے جس کو شعر و ادب سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ لیکن میں نے اپنی فرصت کے مختصر اور منتشر لمحات میں غالب کو اور اُس سے متعلق لٹریچر کو، جو کچھ بھی مل سکا پڑھا ہے۔ دیوان غالب کو مستقلاً پڑھتا ہی رہتا ہوں۔ میں سخن فہم تو خیر کیا شاید غالب کا طرفدار کہا جا سکتا ہوں۔ لیکن آخر یہ طرفداری بھی کیوں ہے؟ ع

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

میں غالب پرستی کے فیشن میں نہیں غالب کو اپنی بساط بھر سمجھنے کی کوشش کر کے اُس کا طرفدار بنا ہوں، بلکہ سچ پوچھیے تو اندھی تقلید اور فیشن کی ریس سے میں اس قدر متنفر ہوں کہ جب میں نے زیادہ تر لوگوں کا رجحان

غالب کی طرف دیکھا تو میں نے پہلے اس کے معترضین ہی کو پڑھنے کی کوشش
کی لیکن ان کے پاس سے سوائے اس کے کچھ نہیں ملا کہ غالب مشکل اور
مغلق کہتے تھے (غالبًا انھوں نے غالب کے مشکل اور مغلق اشعار کے
رموز و نکات اور حسنِ معنی پر غور کرنا ضروری نہیں سمجھا، یا پھر ان کے مقابلتاً
آسان کلام کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا) غالب مہمل کہتے تھے (غالب کا
ایک شعر بھی مہمل نہیں ہے) غالب کے یہاں بعض مقامات پر تعقید لفظی اور
تنافر ہے اور انتخاب الفاظ صحیح نہیں ہے، انھوں نے بعض غلط الفاظ کا
بھی استعمال کیا ہے جیسے ضروری الاظہار، محشرستان (اس کے علاوہ بھی
غالب کے یہاں بہت کچھ ہے اور اُس نے جن نئے الفاظ کا اُردو ادب
میں اضافہ کر دیا ہے اُن کے متعلق کیا خیال ہے؟ ضروری الاظہار اور
محشرستان بالکل صحیح الفاظ ہیں) غالب گھما پھرا کر بات کہنے کے عادی
تھے (اعتراض صحیح نہیں ہے، غالب نے پہلو دار الفاظ ضرور کہے ہیں لیکن
اس صفت سے ان اشعار کا حسن بھی دوبالا ہو گیا ہے) غالب نے اپنے
پیش رُو شعرا کے بعض اشعار کی عکاسی کی ہے (اول تو ایسے اشعار کی
جن پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے تعداد ہی کتنی ہے، اور پھر کیا یہ بات
غالب کے لئے لائق ستائش نہیں ہے کہ اگر اُس نے کسی عامۃ الورود
یا پامال مضمون پر بھی طبع آزمائی کی ہے تو اس نے اس کو ترقی دے کر
پہلے سے بہتر اور موثر انداز میں پیش کیا ہے) وغیرہ وغیرہ۔ ان اعتراضات
یا اسی نوعیت کے دیگر اعتراضات سے، اگر وہ ایک حد تک درست بھی

ہوں، غالب کی عظمت کو کوئی ایسا نقصان نہیں پہونچتا کہ جس سے ان کے مرتبے کے تعین کے لئے نظر ثانی کی ضرورت محسوس کی جائے۔ غالب کے فوق البشر یا عقل کل ہونے کا دعوےٰ نہ آج تک کیا ہے اور نہ بقید ہوش و حواس کر سکتا ہے۔

غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن ابھی تک ۔ ع

بہت نکلے مرے ارمان پھر بھی کم نکلے

والا مضمون ہے۔ غالب کو پڑھتے پڑھتے مجھے بھی اُن کے متعلق لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ پہلے پہل تو یہ خیال بڑا دل شکن تھا کہ جس میدان میں بڑے بڑے نقادان فن کے پَر جلتے ہیں وہاں میرا ایسا کم سواد قدم رکھنے کی جراُت کس برتے پر کر سکتا ہے ؎

تو پست فطرت اور خیال بسا بلند

اے طفل خود معاملہ قد سے عصا بلند؟

لیکن پھر یہ سمجھ کر کہ غالب نے صرف نقادان فن کے لئے نہیں بلکہ یقیناً میرے جیسے عام انسانوں کے لئے بھی شعر کہے ہوں گے۔ میں نے ۱۹۶۰ء میں غالب پر اپنی پہلی تصنیف "باقیات غالب" پیش کی۔ اس میں میں نے کچھ تنقیدی مضامین کے ساتھ غالب کے غیر متداول کلام کا انتخاب اور اُس کے مطالب بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ اس پر اربابِ ذوق نے میری ہمت افزائی فرمائی۔

لہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نائب صدر جمہوریہ ہند نے اس کے متعلق (باقی صنہ پر)

باقیات غالب کے بعد غالب کے بعض ایسے اشعار پر، جن کے متعلق بعض شارحین کے بتائے ہوئے مطالب سے میں نے اپنے آپ کو متفق نہیں پایا تھا، میں نے اخبارات اور رسائل کے لئے چند مضامین لکھے اور پھر اس شوق نے کچھ اور ترقی کی تو رفتہ رفتہ یہ کتاب مُرتب ہوگئی۔

اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے۔ میرا یہ دعوےٰ ہر گز نہیں ہے کہ غالب کے کسی شعر کا جو مطلب میں نے عرض کر دیا ہے وہ مختتم یا فیصلہ کن ہے۔ ہر شعر کا مطلب سمجھنے کے لئے ناظرین کو اپنے ذاتی ذوقِ سلیم کا سہارا لینا چاہئے۔ اس تصنیف سے میری سب سے بڑی غرض یہ ہے کہ لوگوں کے غالب پڑھنے اور سمجھنے کے

(بقیہ حاشیہ صلا) مصنف کو لکھا " آپ کی کتاب بہت خوب ہے میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا " ناشر

امتیاز علی عرشی صاحب مشہور ماہر غالبیات جن کی تالیف دیوان غالب (نسخہ عرشی) پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی کی جانب سے پانچ ہزار روپیہ کا انعام بھی مل چکا ہے، نے باقیات غالب کے متعلق تحریر فرمایا تھا "آپ نے جو کچھ لکھا، بڑی محنت اور بصیرت سے لکھا ہے۔ جزاک اللہ" دوران مطالعہ موجودہ کتاب کے متعلق انھوں نے اپنی رائے کا یوں اظہار کیا ہے "آج کل نشاطِ غالب کے مطالعے میں مصروف ہوں اور آپ کو داد دے رہا ہوں۔ کاش آپ غالب کے عہد میں ہوتے۔ اس غریب کو آپ جیسے شعر فہم کہاں مل سکے ؟ "

ناشر

ذوق و شوق میں اضافہ ہو۔ غالب کی تلاش میں، میں ان کا رہبر نہیں، صرف ہم سفر بننا چاہتا ہوں۔

نشاط غالب کی تکمیل کے بعد میں نے مناسب سمجھا کہ اس کی اشاعت سے پہلے اسے اپنے محترم اور شفیق کرم فرما جناب امتیاز علی صاحب عرشی کو بھی دکھلاؤں۔ میری درخواست پر انھوں نے میرے مسودے کو بڑی توجہ اور کاوش سے پڑھا اور اس کے متعلق اپنے قیمتی مشوروں سے بھی سرفراز فرمایا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عرشی صاحب نے میری خاطر جو زحمت اُٹھائی ہے اور اُن کی جو نوازشیں میرے حال پر رہی ہیں ان کا شکریہ میں کس زبان سے ادا کروں۔ محض رسمی شکریہ ادا کرنا تو چھوٹا منھ بڑی بات کے مصداق ہوگا۔

کئی اشعار کے تحت میں نے جو تمہید لکھی ہے یا اُن سے متعلق کوئی عام بحث چھیڑی ہے اس کے بارے میں عرشی صاحب کا خیال تھا کہ مطالب اشعار کے ماسوا یہ تمام باتیں کتاب کے دیباچے میں لکھی جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کا خیال بالکل درست تھا لیکن میرے لیے دشواری یہ تھی کہ میں نے پوری کتاب اس انداز سے پایۂ تکمیل کو پہونچائی ہے کہ ایک ایک شعر کو لے کر اس پر لکھتا رہا ہوں اور بعد میں جب ان اشعار کی تعداد کافی ہوگئی تو ان سب کو یکجا کر لیا ہے۔ اب اگر ہر تمہید یا بحث کو متعلقہ شعر سے علٰحدہ کر کے پھر لکھوں تو قریب قریب پوری کتاب دوبارہ لکھنا

پڑ جائے گی۔ چونکہ کہنا ایک ہی بات تھی خواہ ایک طویل دیباچے میں کہی جائے، خواہ مختلف اشعار کے ضمن میں جستہ جستہ، لہذا اس سلسلے میں، میں اپنے مسودے میں تبدیلی کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ اپنی اس سہل انگاری کے لئے معذرت خواہ ہوں۔

میں نے اگر بعض شارحین یا نقادانِ فن کی رائے سے اختلاف کیا ہے تو یہ محض "سخن گسترانہ بات" کی تعریف میں آتا ہے اور اس سے "قطع محبت" ہرگز مقصود نہیں ہے۔ میں ان میں سے ہر ایک کو قابلِ احترام سمجھتا ہوں اور اُن کے بلند مرتبے اور نکتہ سنجی کا معترف ہوں۔

میری خواہش تھی کہ عرشی صاحب اس کتاب کا دیباچہ تحریر فرماتے لیکن انھوں نے اپنی صحت کی خرابی اور عدیم الفرصتی کے باعث ایک مختصر خط لکھنے پر اکتفا کی ہے۔ میں اسی کو شائع کر رہا ہوں۔

وجاہت علی سندیلوی　　　　یکم مئی ۱۹۶۲ء

نشاطِ غالب کے متعلق

جناب امتیاز علی عرشی

کا

مکتوب

رام پور

۱۰ر فروری ۱۹۶۴ء

عزیز گرامی قدر سلامت باکرامت رہو

میں نے نشاطِ غالب کو سبقاً سبقاً پڑھا۔ آپ نے جس دیدہ ریزی اور کنج کاوی سے کام لیا ہے، وہ داد اور ستائش کی مستحق ہے۔ شاباش، جزاک اللہ!

غالب کے اشعار کے ساتھ دشمنوں ہی نے نہیں دوستوں نے بھی انصاف نہیں کیا۔ چونکہ غالب تہ دار شعر کہنے کے عادی تھے اس لئے اس کے شارحین نے ہر ہر شعر میں تہ نہیں تہ در تہ کی تلاش کی ہے اور بسا اوقات ایسے ایسے نکتے ایجاد اور اختراع فرمائے ہیں کہ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے!

آپ نے ان حضرات کی تشریح و توضیح پر نہایت عالمانہ انداز سے غور کیا ہے اور جگہ جگہ منصفانہ محاکمہ بھی کیا ہے اور اپنی جداگانہ رائیں بھی درج کی ہیں، میں کیا آپ خود بھی یہ دعوے نہیں کر سکتے کہ جو کچھ آپ نے سوچا ہے وہ حرف آخر ہے لیکن یہ بات میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ اکثر مقامات پر آپ کا انداز فکر غور و خوض کی دعوت دیتا ہے اور یہ ثابت کر دیتا ہے کہ ابھی اشعارِ غالب پر سوچنے کی کافی گنجائشیں موجود ہیں۔ والسلام

مخلص دُعاگو

عرشی

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

خود غالب نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے "ایران میں رسم ہے کہ داد خواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے۔ جیسے مشعل دن کو جلانا، یا خون آلودہ کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا، بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے کہ جو صورتِ تصویر ہے اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل اعتبار محض ہو، موجب رنج و ملال و آزار ہے"

یہ شعر غالب کے سب سے پہلے مجموعۂ کلام (جو بعد میں نسخۂ حمیدیہ کے نام سے شائع ہوا) میں بھی شامل ہے، جس کی کتابت کے وقت غالب کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ غالب اس عمر سے قبل یہ شعر کہہ چکے تھے۔ معنوی بلاغت کے علاوہ بڑے دلآویز اور مترنم الفاظ کے گلدستے کی حیثیت سے بھی یہ شعر عدیم المثال ہے۔ دیوان غالب کا یہ پہلا شعر ہے اور غالب کے زمانے میں رواج تھا کہ دیوان کی ابتدا حمد سے ہوتی تھی غالب نے حمد میں کوئی غزل کہنے کے بجائے صرف یہ ایک شعر کہا ہے اور وہ بھی اپنے منفرد انداز میں، جو حمد ہونے کے علاوہ شکوہ بھی ہے۔

طبا طبائی صاحب کا اس شعر کے متعلق ارشاد ہے "کاغذی پیراہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا نہ کہیں سُنا۔ جب تک اس شعر میں کوئی ایسا

لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو، اُس وقت تک اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے (نہیں معلوم کیوں ؟) مصنف کی یہ غرض تھی کہ نقشِ تصویر فریادی ہے ہستی بے اعتبار اور بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا۔ شعر میں ہستی بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی۔ اس سبب سے کہ قافیہ مزاحم تھا اور مقصود تھا مطلع اس لئے ہستی کے بدلے شوخیٔ تحریر کہہ دیا، شعر بے معنی ہے۔"

غالب کی شوخیٔ فکر کے ساتھ طباطبائی صاحب کی شوخیٔ فہم بھی داد سے مستغنی ہے۔ ان کے علاوہ جتنے بھی غالب کے شارحین ہیں اور جن کی فہرست کافی طویل ہے انھوں نے اس شعر کو نہ صرف بامعنی قرار دیا ہے بلکہ بیشتر نے اسے حسنِ تخیل اور زورِ بیان کا ایک شہ پارہ تسلیم کیا ہے۔ طباطبائی صاحب کا یہ ارشاد کہ کاغذی پیراہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا اور نہ کہیں سُنا، اُن کا صرف ذاتی تجربہ ہے، ورنہ یہ ایران کا ایک بہت پُرانا دستور تھا جس کا ذکر غالب سے پیشتر بھی کئی فارسی شعرا اپنے کلام میں کر چکے ہیں۔ طباطبائی صاحب نے از خود شعر کے معنی پہلے تجویز کر لئے اور شعر پر بعد میں غور کیا اور جب وہ ان معنوں پر پورا نہ اُترا تو اُسے بے معنی قرار دیا۔

بعض دیگر شارحین نے اس شعر کے معنی یوں بیان کئے ہیں :-

سعید ـــــــــــــــــ

"انسان کی بے بود ہستی اور کشاکشِ حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے، حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ کسی چیز کی بھی ہو باعث تکلیف و رنج

ہے حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستیٔ محض ہے بزبانِ حال فریاد کر رہی ہے کہ مجھ کو ہست کرکے کیوں رنجِ ہستی میں مبتلا کیا جیسا کہ اس کی کاغذ پیرہنی سے ظاہر ہے۔"

آسی ونہا :

مولانا روم نے اس مفہوم کو ان اشعار میں ادا کیا ہے :۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند — وز جدائیہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مطلب یہ ہے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہو جانا ضروری ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخیٔ تخلیق کی زبانِ حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔"

بیخود دہلوی :

" ہر پیکرِ تصویر سے مراد جملہ حیوانات، جمادات اور نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نقشِ ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیلِ بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوتِ کامل ہے۔"

اثر لکھنوی :

" ہر شے زبانِ حال سے فریاد کر رہی ہے کہ اے ہمارے پیدا کرنے والے مصورِ بے بدل! تو نے ہماری تخلیق و تشکیل میں کیا کیا صنعتیں و حکمتیں

صرف کیں، لیکن کیا قیامت ہے کہ جو ہے دست برد فنا میں ہے، نہ قرار ہے نہ ثبات ہے، اگر مٹانا تھا تو بنانے میں اتنا اہتمام اتنا تکلف کیوں کیا۔"

نیاز فتحپوری۔

"اس نگار خانۂ عالم کی ہر ہر چیز، نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبانِ حال سے اپنی ناستواری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے۔"

پروفیسر سلیم چشتی۔

"غالب کا یہ شعر جو سرِ مطلع دیوان ہے ان کی شوخیِ فکر کا بلاشک و شبہ آئینہ دار ہے۔ انھوں نے حمد کے پردے میں خدا سے گلہ کیا ہے کہ اے خدا! کہ جب تو نے ہر مخلوق کو فنا کے لئے پیدا کیا تو پیدائش میں اس قدر کمال کا اظہار کیوں کیا؟ بالفاظِ دیگر جب ہست کر کے مٹانا منظور تھا تو ہست کرنا ہی کیا ضرور تھا۔ یہ تو اور بھی کس قدر حیرت انگیز ہے کہ غالب کے جرمن ہم عصر شوپن ہار نے بھی ہستی سے متعلق یہی نظریہ پیش کیا ہے کہ ہستی سراپا کشمکش، اذیت اور شر ہے۔ ہستی کی تہ میں ارادہ کار فرما ہے اور سارا فساد اسی کا پیدا کردہ ہے۔"

اب میں اس شعر کے جو معنی سمجھا ہوں وہ عرض کرتا ہوں:۔

نقش:۔ صورت، ہر چیز جو عالمِ وجود میں آئے، ہستی۔ نگار خانۂ عالم۔

فریادی:۔ فریاد کرنے والا، پناہ مانگنے والا، مبتلائے غم۔

شوخیِ تحریر:۔ نقش کی رعنائی، تخلیق کی ستم ظریفی۔

کاغذی پیرہن:۔ فریادی کا لباس، چونکہ کاغذ جلد پھٹ جاتا ہے

لہذا کنایہ ہے عدم ثبات سے۔

پیکرِ تصویر :- تصویر کے نقش و نگار، کوئی بھی چیز جو تصویر کی طرح دلآویز یا خوبصورت ہو۔ کنایہ ہے مخلوقات کے وجودِ ظاہری سے۔

شاعر حیرت سے پوچھتا ہے کہ یہ سارا نگارخانۂ عالم کس کی (مراد خدا سے ہے) تخلیق کی ستم ظریفی پر فریادی بنا ہوا ہے؟ یہاں کی ہر چیز دلآویز ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مبتلائے غم اور بے ثبات بھی کیوں نظر آتی ہے؟ خدا کو اُسے مبتلائے غم اور فنا آمادہ بنانا تھا تو اُس نے زندگی اس قدر دلآویز بنایا ہی کیوں؟

غالب نے صرف لفظ "نقش" سے پورا نگارخانۂ عالم مراد لیا ہے "نقش" کی رعایت سے تحریر کہا ہے جو تخلیق کے معنی ادا کرتا ہے۔ گویا یہ ساری کائنات خدا کی تحریر ہے۔ صرف لفظ شوخی سے یہ معنی پیدا کر دیے ہیں کہ تخلیق کا کرم بھی بڑا پُر ستم ہے۔ کاغذی پیرہن سے نہ صرف مبتلائے غم ہونا بلکہ بے ثبات ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک لفظ تصویر سے تخلیق کا حسن اور کمال ظاہر کر دیا ہے، خوبصورت اور کارگیری کو نمایاں کرنے والی چیز کو تصویر سے تشبیہ دی جاتی ہے، انگریزی کا ایک عام محاورہ ہے "تصویر کی طرح خوبصورت" تصویر عام طور سے کاغذ پر بنائی جاتی ہے لہذا کاغذی پیرہن میں یہ رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ غرض کہ اس شعر کا ہر لفظ ایک گنجینۂ معنی ہے جو دوسرے لفظ کو زور پہونچا رہا ہے۔ الفاظ کم سے کم اور معنی نہ صرف زیادہ سے زیادہ بلکہ لطیف سے لطیف تر، اسی کو قادر الکلامی کا اعجاز کہتے ہیں جو ادب کے نگارخانے میں غیر فانی نقوش ثبت کر جاتا ہے۔

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟

غالب کے اس شعر کے متعلق بعض ارباب نظر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عرفی کے مندرجہ ذیل شعر کی عکاسی کرتا ہے ؂

منم آں سیر ز جاں گشتہ کہ با تیغ و کفن
تا در خانۂ جلاد غزل خواں رفتم

حضرت آرگس (فرضی نام ایک صاحب کا جنھوں نے ماہنامہ نگار لکھنؤ میں غالب بے نقاب کے عنوان سے ایک مضمون یہ ثابت کرنے کے لئے لکھا تھا کہ غالب کے بہت سے اشعار میں فارسی اساتذہ کے اشعار کا عکس نظر آتا ہے) کا کہنا ہے "عرفی کے یہاں غزل خواں رفتم والا ٹکڑا اس قیامت کا ہے کہ جواب ہی نہیں۔" غالباً ان کے کہنے کا مقصود یہ ہے کہ غالب نے عرفی کے پامال مضمون پر قلم بھی اُٹھایا تو اس کو اس لطافت سے نبھا نہ سکے جو عرفی کا حصہ تھا۔ مطلب یہ کہ ایک تو نقل کی اور پھر وہ بھی ایسی کہ وہ اصل کو صرف منھ چڑاتی رہ گئی۔

علامہ بیخود موہانی نے اس کا جواب اپنی کتاب گنجینۂ تحقیق میں یوں دیا ہے "عاشق اپنے دل میں غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ میں نے اب تک جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والوں کی صورت ہی نہیں بنائی اور یہی سبب ہے کہ وہ (میرا معشوق) کسی نہ کسی بہانے مجھے ٹال دیا کرتا ہے۔

آج اس سازوسامان سے جاتا ہوں (یعنی کفن اور تلوار لے کر) اب تو کوئی عذر رہ ہی نہیں سکتا۔ اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق معشوق کے ہاتھ سے قتل ہونے ہی کو مآل زندگی سمجھتا ہے۔ عرفی کے شعر میں جب تک "سیر زجاں گشتہ" کا ٹکڑا موجود ہے اس وقت تک غزل خواں رفتم کے ہوتے ہوئے بھی وہ غالب کے شعر کی گرد کو نہیں پہونچ سکتا۔ اس لیے کہ جان سے بیزار ہونے پر مرنے کی خوشی اور چیز ہے اور معشوق کے ہاتھوں قتل ہو جانے کی تدبیر سمجھ میں آنے پر پھولوں نہ سمانا اور چیز ہے۔"

مجھے ان دونوں مقابل اشعار کے متعلق عرض یہ کرنا ہے کہ ان کا مضمون بہت عامۃ الورود ہے جس میں کوئی خاص نکتہ نہیں ہے۔ غالب اور عرفی کے علاوہ بھی بہت سے دوسرے شعرا نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ اس نوعیت کے اشعار میں صرف مختلف شعرا کا انداز بیان قابل غور ہوا کرتا ہے جس سے ان کے مجموعی تاثر میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لہذا صرف مضمون شعر پر سرقہ یا توارد کا الزام لگا دینا بڑی زیادتی ہے کیونکہ اس نظر سے دیکھا جائے تو ہمیں اپنی شاعری کا بیشتر سرمایہ دریا برد کر دینا پڑے گا۔ زندگی میں کوئی چیز نئی نہیں ہے صرف اس کے پیش کئے جانے کے انداز ہی نئے ہو سکتے ہیں۔

مجھے بجنوری مولانا حالی صاحب سے اس بات پر اتفاق نہیں ہے کہ عرفی کا شعر غالب کے شعر کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ میری گزارش یہ ہے کہ دونوں شعرا نے ایک ہی مضمون کے بالکل جدا جدا پہلوؤں پر زور دیا ہے۔ البتہ

یہ بات ضرور ہے کہ غالبؔ نے جس بات پر زور دیا ہے وہ مقابلتاً زیادہ دل پذیر اور فکر انگیز ہے اور اس سے ایک ڈراما ئی تجسس پیدا ہو گیا ہے۔ عرفیؔ نے جو کچھ کہنے کی کوشش کی تھی اُسے اپنے اندازِ بیان سے یقیناً حدِ کمال کو پہونچا دیا ہے۔

عرفیؔ مرنے کی خوشی اور اشتیاق ظاہر کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے ع

تا در خانۂ جلّاد غزل خواں رفتم

بہت خوب کہا ہے۔ "سیر ز جاں گشتہ" کے معنی بیخود موہانی صاحب نے جان سے بیزار ہونا مُراد لئے ہیں، حالانکہ اس کے معنی زندگی سے دل بھر جانا یا آسودہ ہو جانا بھی ہو سکتے ہیں، جس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ صرف زندگی سے نفرت ہی کی وجہ سے ہو۔

غالبؔ کے شعر میں معرکۃ الآرا ٹکڑا۔ ع

عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

ہے "آج" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معشوق آئے دن قتل نہ کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیا کرتا۔ کبھی کہتا تلوار نہیں ہے، کبھی کہتا تمھارے کفن کا انتظام کون کرے گا وغیرہ وغیرہ۔ شاعر ان سب عذرات کے متعلق جو معشوق اب تک کرتا چلا آیا تھا، پیش بندی کر کے ہر طرح سے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر اپنے آپ سے یا دیکھنے والوں سے پوچھتا ہے کہ کوئی بات رہ گئی ہو تو بتاؤ۔ اب اس تیاری کے بعد دیکھیں معشوق قتل نہ کرنے کا کون سا بہانہ ڈھونڈھتا ہے۔ قاعدے سے تو اب کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔

شعر کا پڑھنے والا کئی باتیں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیا عاشق آج قتل ہو جائے گا؟ کیا آج بھی معشوق اس کے قتل نہ کرنے کا کوئی بہانہ ڈھونڈھے گا؟ کیا معشوق کا عذر صحیح ہوگا؟ کیا وہ عاشق کو اس سے محبت یا اپنی ایذا پسندی کی وجہ سے قتل ہی نہیں کرنا چاہتا؟ وغیرہ وغیرہ

عرفی کا شعر صرف ایک خاص کیفیت بیان کرتا ہے اور خوب بیان کرتا ہے۔ غالب کا شعر ایک مسئلہ یا صورت حال پیش کرتا ہے جو کئی پہلوؤں کی حامل ہے۔ غالب قابلِ ملامت نہیں قابل ستائش ہیں کہ انھوں نے عرفی کے مضمون پر طبع آزمائی کی تو ایسی کہ خود عرفی کے لئے قابلِ رشک بن گئے۔

عرفی کے مضمون سے بجائے شعر مندرجۂ بالا کے غالب کا یہ شعر زیادہ قریب ہے ؎

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرگل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

اس میں عرفی کا "سر زجاں گشتہ" کا قابل اعتراض (بقول حضرت یگانہ دوہانی) مفہوم موجود نہیں ہے۔ اس میں غالب نے ایک بالکل ہی دوسری کیفیت پیدا کر دی ہے۔ عرفی کا "غزل خواں رفتم" کا ٹکڑا جس کے متعلق حضرت آرگس کا ارشاد ہے کہ "اس قیامت کا ہے کہ جواب ہی نہیں" غالب کے اس ٹکڑے (کہ خیال زخم سے نگاہ کا دامن پُرگل ہے یعنی پھولوں سے بھرا ہے) کے مقابلے میں بالکل روکھا پھیکا معلوم ہوتا ہے۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

غالب کے بعض نکتہ چینوں نے ان پر یہ الزام لگانے کی کوشش کی ہے کہ ان کے کچھ اشعار ایسے بھی ہیں کہ جن کا مرکزی خیال بعض مشہور فارسی شعرا کے اشعار سے لیا گیا ہے۔ کچھ حضرات نے الزام تو نہیں لگایا ہے البتہ اپنے مطالعہ کی وسعت ظاہر کرتے ہوئے، غالب کے چند اشعار کے متعلق صرف اس اشارے پر اکتفا کی ہے کہ اسی بات کو فلاں فارسی شاعر نے یوں کہا ہے اور خوب کہا ہے۔ کسی شاعر کے کلام کا دوسرے شاعر سے موازنہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ موازنہ اور مقابلہ سخن فہمی اور نکتہ سنجی کے واسطے ایک امر لازم ہے اور بغیر اس کے ارباب ذوق پر کسی شاعر کے حقیقی جوہر آشکار ہی نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر اس اشارے سے در پردہ یہ بتانا مقصود ہو کہ غالب نے کسی شعر کا مرکزی خیال کسی دوسرے شعر سے لیا ہے تو یہ اشارہ بھی یقیناً ایک اعتراض کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

مجھے اس الزام یا اعتراض کی بنیاد ہی سے اختلاف ہے۔ شاعر موجد ہونے یا حرف اول کہنے کا دعویدار نہیں ہوتا، وہ بیشتر عامۃ الورود باتیں کہتا ہے البتہ اس کے کہنے کا انداز اور اسلوب جداگانہ ہوتا ہے، اور اس کو زیادہ پُرتاثیر اور زوداثر بنانے کے لئے وہ تشبیہات، استعارات، تلمیحات اور محاوروں کے برجستہ استعمال وغیرہ کی مدد سے اپنی جدت طبع اور

پرواز تخیل کے جوہر دکھاتا ہے۔ اس کے لیے یہ قید لگانا کہ وہ کوئی ایسی بات نظم ہی نہ کرے کہ جس کا مرکزی خیال کوئی دوسرا شاعر اس سے پہلے نظم کر چکا ہو، اس کے لیے ایک ناممکن الحصول معیار قائم کرنا ہے۔
معشوق خوبصورت ہے، اس کی ہر ادا دل ربا اور ایمان شکن ہے معشوق بے وفا ہے، بے رحم ہے اور عاشق کو اذیتیں پہونچاتا ہے۔ عاشق باوفا ہے، معشوق پر اپنی جان فدا کرنے کے لیے تیار رہے، اس کے ہجر میں انگاروں پر لوٹتا رہتا ہے۔ زمانہ ناقدرشناس ہے۔ دوست در پے آزار رہتے ہیں۔ عاشق بے کس اور مظلوم ہے۔ معشوق کے بغیر ساری دنیا سے بیزار ہے، اپنی موت کو ہر وقت پکارتا رہتا ہے مفلس ہے لیکن شراب پینے کا بے حد شائق ہے۔ گنہگار ہے لیکن رحمت پروردگار سے اپنی بخشش کی توقع رکھتا ہے۔ ہر چیز میں ذات خداوندی کا جلوہ ہے۔ موت برحق ہے، زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ زاہد منافق ہے۔ رقیب کمینہ پرور ہے، ناصح یاوہ گو ہے وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان صرف چند باتوں کو مرکزی خیالات مان لیے جائیں تو اردو شاعری کے کچھ نہیں تو پچہتر فیصدی اشعار میں ان کی بھرپور پرچھائیاں ملیں گی۔ کیا میر اور سودا، کیا ذوق اور مومن، کیا ناسخ اور آتش۔ اور بعد کے غزل گو شعرا کا تو ذکر ہی کیا، سب اسی گرفت میں آجائیں گے کہ ان کے کلام کا معتدبہ حصہ ایسا ہو کہ جس کے مرکزی خیالات کو ان سے پیشتر کے شعرا کہہ چکے ہیں۔ اور زیادہ تحقیق اور تجسس سے کام لیا جائے تو پیشتر کے

شعرا نے یہی مرکزی خیالات اپنے جن پیشرو بزرگوں سے لیے ہوں گے ان کی بھی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور بالآخر بات وہاں تک پہونچ سکتی ہے جب پہلے مرد نے پہلی عورت سے اظہار محبت کیا ہوگا۔

غالب کی یہ بدنصیبی نہیں بلکہ خوش نصیبی ہے، یہ ان کے کلام کا عجز نہیں بلکہ افتخار ہے کہ ان کے متقدمین اور دوسرے معاصرین کے کلام کو ان کے کلام کے مقابلے میں اتنا قابل اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا کہ اس کے متعلق بھی اس قسم کی کوئی تحقیقات کی جاتی کہ اس کے مرکزی خیالات کو کہاں کہاں سے لیا گیا ہے۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند کے مصداق یہ شرف صرف انھیں کو حاصل ہوا کہ ان کے کلام کو ارباب ذوق نے نہ صرف عینک سے بلکہ خورد بین سے دیکھنے کی ضرورت سمجھی اور اس کے بعد بھی نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ان کے ہزاروں متداول اور غیر متداول اشعار میں سے مشکل سے صرف پچاس ساٹھ کے متعلق یہ اشارہ کرنے کی ہمت کی جا سکی کہ ان کے مرکزی خیالات کو کسی دوسری جگہ سے لیا گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس کسوٹی پر کسے جانے کے بعد غالب کی عظمت کو اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ دوسرے شعرائے کرام کو اس قسم کے امتحان میں مبتلا کیا جائے تو نہیں معلوم اُن کا کیا حشر ہو۔

واضح رہے کہ میرے یہ معروضات عامۃ الورود موضوعات سخن سے متعلق ہیں۔ میں اس حقیقت سے بیگانہ نہیں ہوں کہ اگر کسی شاعر نے کوئی نئی اور اچھوتی بات کہی ہو یا کسی خاص انداز بیان یا ندرت تخیل کا اظہار کیا

ہو اور کوئی دوسرا شاعر اس کی نقل کر دے اور سرقۂ ظاہر یا سرقۂ غیر ظاہر کا مرتکب ہو تو وہ یقیناً سرزنش کا مستحق ہے۔ غالب کا کلام ان عیوب سے پاک ہے۔ الزام لگانے والوں نے ان کے دو چار اشعار کے متعلق سرقہ کا بھی الزام لگایا، لیکن ان لوگوں نے اس بات پر بھی غور نہیں کیا کہ اگر کسی مقابلۃً پست مضمون کو بلند کر دیا جائے تو وہ سرقے کی تعریف میں نہیں آتا۔ نقل اصل سے بڑھ جائے تو اس کی اپنی ایک علیحدہ حیثیت قائم ہو جاتی ہے۔

ماہنامہ نگار لکھنؤ کے فروری ۱۹۲۸ء کے شمارے میں "غالب بے نقاب" کے عنوان سے ایک مضمون میں ایک صاحب نے جو گمنام رہنا قرین مصلحت سمجھتے تھے "آرگس کے فرضی نام سے غالب کے بعض اشعار کو متقدمین کے اشعار کی عکاسی یا خوشہ چینی کرنے کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ اس کے جواب میں حضرت نجو دموہانی نے ایک بڑا پر مغز اور بصیرت افروز مضمون "آرگس بے حجاب بجواب غالب بے نقاب" لکھا تھا جو اسی زمانے میں نیرنگ خیال لاہور، اور جام جہاں نما لکھنؤ میں شائع ہوا تھا، اور اب مصنف کی کتاب گنجینۂ تحقیق میں شامل ہے۔ اس مضمون میں حضرت نجو دموہانی نے حضرات آرگس کے الزامات اور اعتراضات کو نہ صرف بالکل پوچ اور باطل بلکہ مدلل بحث اور تحقیق سے یہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ حضرت آرگس غالب کے جن اشعار کو متقدمین کے جن اشعار کا عکس بتاتے ہیں ان کے بیشتر مقامات پر، صحیح مطالب سمجھنے ہی سے وہ قاصر رہے تھے اور دراصل متقابل اشعار کے

درمیان بہت بڑا اور واضح فرق موجود تھا۔

زیادہ تر دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ سرقہ یا بنیادی خیال کی عکاسی کا الزام لگانے والے حضرات محض چند الفاظ کی یکسانیت یا صرف ایک حد تک خیال کی مطابقت دیکھ کر باتیں اُڑاتے ہیں اور یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ دو بظاہر متقابل اشعار کا مجموعی تاثر ایک دوسرے سے کتنا مختلف ہے۔ حضرت آرگس نے غالبؔ کے جن اشعار کے متعلق سرقہ کا الزام لگایا ہے ان میں سے اکثر نہیں بیشتر ایسے ہیں جن کو اپنے مفروضہ اصل سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ مثال کے طور پر صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں کہ کس طرح صرف غالبؔ کو بدنام کرنے کے لئے کیسی کیسی دُور کی کوڑیاں لائی گئی تھیں۔

(غالبؔ) میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

(عالی شیرازی) خواستم آتشِ دل را بنشانم بہ سرشک
آں قدر ہم جگر سوختہ ام، آب نداشت

(غالبؔ) کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

(حافظ) آفریں بر دلِ نرمِ تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہٗ

(غالبؔ) یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

(خسرو) زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمے دانم
چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہانِ ما

(غالب) وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(عرفی) بہ کیش برہمناں آں کس از شہیدان ست
کہ در عبادتِ بُت روئے بر زمیں میرد

اب بات چھڑ گئی ہے تو چند وہ اشعار بھی سُنتے چلیے جن کے متعلق حضرت آثر لکھنوی کا خیال ہے کہ ان کو غالب نے میر سے متاثر ہو کر کہا ہے۔

(غالب) نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

(میر) مری نمود نے مجھ کو کیا برابر خاک
میں نقشِ پا کی طرح پائمال اپنا ہوں

(غالب) لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ بادِ بہاری کا

(میر) آدم خاکی سے عالم کو جِلا ہے ورنہ
آئینہ تھا تو مگر قابلِ دیدار نہ تھا

وغیرہ وغیرہ

زیب عنوان شعر سے

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اتنا صاف شعر ہے کہ کسی تشریح کا محتاج نہیں لیکن میں نے اس کا انتخاب صرف اس بات کو دکھانے کے لئے کیا ہے کہ وہ اشعار بھی جو ایک ہی موضوع پر ہیں اور جن میں بظاہر خیال کی بڑی یکسانیت معلوم ہوتی ہے درحاصل جداگانہ معنویت کے حامل ہوتے ہیں اور پڑھنے والے پر علیحدہ علیحدہ تاثر چھوڑتے ہیں۔ اس شعر کے مقابل میں میلی کا یہ شعر پیش کرکے ؎

بیم از وفا مدار، بدہ وعدہ کہ من
از ذوقِ وعدہ تو بہ فرد امی رسم

حضرت آرگس نے فرمایا ہے "میلی نے کہا تھا کہ تو وعدہ کر اور ایفائے وعدہ کا خیال ہی نہ کر، ادھر تو نے وعدہ کیا اُدھر خوشی سے ہمارا دم نکلا۔ بالکل یہی خیال غالب کے یہاں ہے۔ مگر میلی کے یہاں قبل وعدہ ہے اور یہاں بعد وعدہ"

حضرت تنہا نے اس کا جواب یوں دیا ہے "نیشاپوری وعدہ کے ذوق میں مرجانے کا یقین دلاکر محبوب سے عہد و پیمان لینا چاہتا ہے۔ غالب صدق و کذب وعدہ کا ایک اچھوتا معیار پیش کرتا ہے۔ اختلاف مضمون مستزاد برآں۔ غالب کا حسن بیان شعر کو نیشاپوری کے شعر سے بلند تر کئے ہوئے ہے۔"

حضرت نجو دموہانی کا ارشاد ہے "میری رائے میں حضرت آرگس کا خیال صحیح ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ دونوں خیال یکساں ہی نہیں، بلکہ ایک ہیں۔ حضرت سہا جس کو اچھوتا معیار قرار دیتے ہیں وہ بالکل اسی طرح بلکہ اُس سے کہیں بہتر صورت میں میکی کے یہاں پایا جاتا ہے مگر یہ مضمون عام ہے اس لئے کہ انتہائی خوشی میں مرجانا مشہورات میں سے ہے جس پر شادی مرگ کی شہرت شاہد عادل ہے۔ پھر وعدۂ وصل یار کی خوشی میں مرجانا کون سی بڑی بات ہے۔ اس لئے اسے نہ ترجمہ کہئے نہ سرقہ، یہ توارد کہا جاسکتا ہے۔ میرے نزدیک میکی کا شعر نزاکت و بلندی خیال کے اعتبار سے مرزا غالب کے شعر سے کہیں بالاتر ہے اس لئے کہ کہاں وعدۂ یار کی خوشی میں مرنہ جانے کی معذرت کرنے کے لئے زندہ رہنا اور کہاں قبل وعدہ، وعدۂ وصل کی خوشی میں مرجانے کا یقین ہونا"

میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ یہ شعر توارد کی تعریف میں ہرگز نہیں آتا۔ دونوں میں بالکل جداگانہ بات کہی گئی ہے اور دونوں کے مجموعی تاثر میں بڑا فرق ہے۔ اب یہ بالکل دوسری بات ہے کہ بعض ارباب ذوق کی نظر میں میکی نیشا پوری کا شعر زیادہ بہتر ہو۔ یہ دعوے نہ کسی نے کیا ہے نہ کرسکتا ہے کہ غالب نے جس موضوع پر قلم اُٹھایا اُس میں وہ سب شاعروں سے بازی لے گئے، بلندی کے ساتھ پستی اُن کے یہاں بھی ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ مقابلۃً ان کے اچھے اشعار بہت زیادہ ہیں، اور ان میں بھی جو بہت اچھے ہیں وہ لاجواب ہیں اور انھوں نے دنیائے ادب

میں ایک غیر فانی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے معمولی اشعار کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے لیکن ان سے ان کے مرتبے اور درجے کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا۔ ایسے پست اشعار کی تعداد کہ جو ان کے شایانِ شان نہیں کہے جا سکتے بہت ہی کم ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ پست اشعار کی جتنی تعداد میر، سودا۔ ذوق اور مومن جیسے عظیم المرتبت شعرا کی پچاس ساٹھ غزلوں میں نکل آئیں گے اتنے غالب کے پورے دیوان میں بھی نہیں نکلیں گے۔

شعر زیر بحث کا مطلب حضرت آسی نے یوں بیان کیا ہے "یہ ہم تیرے وعدہ کرنے سے جیئے تو تونے یہ سمجھ کر جھوٹ جانا کہ اگر ہمارے وعدہ کا اعتبار ہوتا تو تجھے شادی مرگ ہو جاتی"۔

حضرت نظم طباطبائی نے اس شعر کی یوں تشریح کی ہے "ہم نے جو یہ کہا کہ فقط وعدہ وصل سن کر ہم مرنے سے بچ گئے تو تم نے جھوٹ جانا"۔

اس شعر میں 'جان' کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ 'سمجھ' اور دوسرے یہ کہ محبوب کو پیار سے مخاطب کیا ہے۔ اور اس طرح 'تو یہ جان جھوٹ جانا' کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔

(۱) تو اے جان! تونے اسے جھوٹ سمجھا کہ ہم تیرے وعدے کے سہارے جی رہے ہیں۔

(۲) تو سمجھ لے کہ ہم نے تیرے وعدے کو سچا نہیں سمجھا۔

(۳) ہمیں اپنی اس خوش قسمتی پر یقین نہیں آیا کہ تو ہم سے وعدہ کرے گا۔

اس شعر کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے جیسا کہ حضرت آسی، نظم طباطبائی اور بہت سے دیگر شارحین نے مختصراً بیان کیا ہے یعنی ہم اپنی زندگی سے عاجز آکر مرنے کی ٹھان چکے تھے لیکن جب تو نے وعدہ کر لیا تو ہم اس کے ایفا ہونے کی امید موہوم کے سہارے جیتے رہے ہیں لیکن تو اسے جھوٹ سمجھتا ہے اور بجائے اس کے کہ ہمارے اس بھروسے کی قدر کرے اور اس بنا پر اپنے وعدے کو ایفا کرنے کی کوشش کرے تو اُلٹا ہمیں یہ طعنہ دیتا ہے کہ تمھیں میرے وعدے کا اعتبار ہی نہ تھا ورنہ تمھیں شادی مرگ ہو جانا چاہیے تھا۔ حاصل کلام یہ کہ معشوق کی بات کا اعتبار کرو تو مشکل، اور نہ کرو تو مشکل۔ اس کی ناراضگی دونوں ہی صورتوں میں قائم رہتی ہے۔ یہ جملہ استفہامیہ، کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا، شوخی، بے ساختگی اور ساتھ ہی ساتھ بڑی معصومیت کا حامل ہے۔ اس سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ معشوق کو ہمارے عشق پر اعتبار ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اگر ہم اس کے کسی وعدے کو سچا سمجھ لیں گے تو مارے خوشی کے مر جائیں گے[۱]۔

ان مطالب کے پیش نظر اس شعر کو میلیؔ کے شعر سے کوئی مناسبت نہیں رہتی، سوائے اس کے کہ ان دونوں ہی اشعار میں وعدے اور اس کی خوشی میں مر جانے کا ذکر آیا ہے۔ دونوں کا پس منظر بالکل مختلف ہے۔

شعر کا دوسرا مطلب جیسا کہ حضرت سہا، آرگس اور حضرت بیخودؔ دہلوی اور بعض دوسرے شارحین نے سمجھا ہے یہ ہوگا کہ تیرے وعدۂ وصل

---

[۱] یہ مطلب درست نہیں ہے۔ — محرّ شی

کے بعد بھی اگر ہم جیتے رہے تو سمجھ لے کہ ہم نے تیرے وعدے کو، سچا ہی نہیں سمجھا تھا کیونکہ اگر سچا سمجھا ہوتا تو کیا ہم مارے خوشی کے مر نہ چکے ہوتے؟ حاصل کلام یہ کہ اگر ہم کو تیرے وعدے پر اعتبار آ جائے تو ہم کو شادی مرگ ہو جائے۔ ہم زندہ ہیں تو صرف اس وجہ سے کہ ہم کو اس کا یا اپنی ایسی خوش قسمتی کا کہ تو ہم سے وعدہ کر کے پھر اس کو ایفا بھی کرے گا اعتبار ہی نہیں ہے۔

میکش کے شعر کا مطلب یہ ہے کہ تو ایفائے وعدہ کا خوف نہ کر اور صرف مجھ سے وعدہ کرے کیونکہ تیرے وعدے کی خوشی کے مارے میں زندہ ہی نہیں رہوں گا۔

اس شعر میں یہ ٹکڑا کہ ع از ذوقِ وعدۂ تو بفزدائمی رسم، یعنی تیرے وعدے کی خوشی میں میں زندہ ہی نہ بچوں گا، واقعی داد سے مستغنی اور لاجواب ہے۔ شاعر کا وعدے کے متعلق حُسنِ طلب بہت خوب ہے۔ اس نے ایک ایسی صورت معشوق کے سامنے رکھ دی ہے کہ اب اس کے لئے وعدہ نہ کرنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ ایک پُر لطف پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ اب اگر معشوق وعدہ کرنے سے انکار کرتا ہے تو در پردہ اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اُسے عاشق کی زندگی پیاری ہے جو خود اس کی محبت کا ثبوت ہو جاتا ہے، لہذا وعدہ کر لینا اس کے لئے ناگزیر سا ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف عاشق کا وفورِ ذوق و شوق اس انتہائی درجے پر ہے کہ اُسے یقین کامل ہے کہ صرف معشوق کے مُنھ سے وعدۂ وصل کا اقرار سنتے ہی وہ مارے خوشی کے مر جائے گا۔

شاعر نے واقعی بڑی جدتِ طبع دکھائی ہے، لیکن اس کوشش میں وہ بعض ضروری قیود کو نظر انداز کر گیا ہے، چنانچہ یہ شعر کسی مشاعرے میں تو بے پناہ داد حاصل کر سکتا ہے کیونکہ اس میں ایک بڑی چلبلی پھرتی بات کہی گئی ہے، لیکن مخصوص حلقۂ ادب میں تنقید کی کسوٹی پر پورا نہیں اُتر سکتا اور اس کے متعلق کئی بنیادی اعتراضات کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) شاعر در پردہ نہیں بلکہ صاف صاف معشوق کو اُکسا رہا ہے کہ مجھ سے جھوٹا ہی وعدہ کرے۔ ع ہیم از وفا مدار...... تو کیا یہ جانتے ہوئے بھی کہ مجھ سے جھوٹا وعدہ محض مجھے بہلانے کے لئے کیا جا رہا ہے شاعر کو شادی مرگ ہو جائے گی؟ یہ تو کوفت یا شرم سے مرنے کا مقام ہوا نہ کہ مارے خوشی کے۔ اور اگر معشوق کے اس نفرت آمیز سلوک کے بعد بھی شاعر کو مارے خوشی کے موت آجاتی ہے تو آپ کو اس کی جاں نثاری سے زیادہ اُس کی خود فریبی اور سادہ لوحی کی داد دینا پڑے گی۔

(۲) 'ہیم از وفا مدار' کہہ کر عاشق اگر معشوق سے وعدہ لے رہا ہے تو اس کے صرف یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ اُسے معشوق کے وعدے کی قدر و قیمت کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ وہ تو محض اپنے مرنے کا بہانہ ڈھونڈھ رہا ہے۔ وہ مرنے کے لئے ایسا اُدھار کھائے بیٹھا ہے کہ اس کے دل میں معشوق کے وعدے کے ایفا کئے جانے کی بھی نہ صرف کوئی تمنا اور خواہش باقی نہیں ہے بلکہ وہ اُسے صریحاً غیر ضروری سمجھتا ہے۔

(۳) اگر شعر کو اور نازک معنوں میں لیا جائے یعنی تیرے وعدۂ وصل

کے اقرار کی ادا پر مرجاؤں گا تو غالباً وہ شعر اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا جس میں صرف معشوق کی ایک جھلک دیکھ پانے کی خوشی میں مرجانے کا تذکرہ کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کس قدر مضحکہ انگیز ہوگا۔

غالب کے شعر کے پہلے معنی تو خیر بالکل ہی مختلف ہیں دوسرے معنی بھی کم سے کم ان اعتراضات سے پاک ہیں جو تیلی کے شعر پر کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت تجوّذ موہانی کا یہ فرمانا کہ غالب کے شعر میں معشوق کے وعدہ کر لینے کے بعد بھی زندہ رہنے کی معذرت خواہی ہے، بالکل درست ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس سے عاشق کی خودداری کا بھی ایک نمایاں پہلو نکلتا ہے یعنی وہ معشوق کے کسی جھوٹے وعدے پر مرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ غالب کا عاشق بالکل ریشہ خطمی قسم کا انسان نہیں ہے بلکہ اُس کی بھی اپنی غیرت نفس ہے۔ دراصل غالب کا شعر زیر بحث جس میں انھوں نے معشوق کے وعدے کو جھوٹ سمجھا ہے، اپنے زمانے کی روایتی عاشقی سے ایک علیحدہ چیز ہے۔ معشوق کے جھوٹے وعدوں کے سلسلے میں ایک جگہ اور کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے ؎

سادہ پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں؟

بہرکیف غالب کا شعر تیلی کے شعر کا نہ خوشہ چیں ہے اور نہ عکاس۔ غالب نے اپنی ایک الگ بات کہی ہے۔ وہ کہی ہوئی بات جان بوجھ کر کہتے تو پھر دب کر نہ کہتے۔ شاعرانہ مبالغے میں

بھی (جو اکثر ان کے قدردانوں کو بھی گراں گزرتا ہے) وہ اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔

وعدے کے موضوع پر غالب کا ایک دوسرا شعر ملاحظہ ہو ؎

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

مولانا حالی نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں "میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہونچا...... بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے"

سہا اور آسی صاحبان نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے "خدا جس کی میں نے عبادت کی کیا وہ نمرود تھا، اور اس کی خدائی نمرود کی خدائی تھی کہ اس میں میری بندگی سے میرا بھلا نہ ہوا۔"

شعر کے الفاظ سے سہا اور آسی صاحبان کے معنی بھی درست ہو سکتے ہیں، یعنی شاعر بہت جل کر خدا کی خدائی کو نمرود کی خدائی کے مترادف قرار دے رہا ہے جیسے ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ۔

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

لیکن جب شعر کے دوسرے بہتر اور زیادہ پر اثر معنی بلا تکلف نکل سکتے ہیں تو یہ معنی قبول کر لینا ہرگز مناسب نہیں ہے۔

نظم طباطبائی صاحب نے اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ شاعر معشوق کے غرورِ حسن کے خلاف شکایت کر رہا ہے۔

اس شعر کے ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے

کہ نمرود نے خدائی کا دعوے کیا تھا اور میں نے تیری بندگی کی تھی، لیکن دونوں کا انجام ایک ہی رہا، یعنی نامرادی اور ناکامی۔ تیرا یہ کیسا انصاف ہے کہ تو نے نمرود کے خدائی کے دعوے جیسی زبردست نافرمانی اور بغاوت کا اور میری بندگی کا ایک ہی صلہ دیا؟ تو نے اپنے نافرمان اور فرمانبردار بندوں کو ایک ہی قسم کے سلوک مستحق کیوں سمجھا؟

دوسرے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ شاعر اپنی بندگی کا تجزیہ کر رہا ہے وہ کہتا ہے کہ کہیں میری بندگی میں خلوص نیت کے بجائے پندار، نخوت، خود پرستی یا خود نمائی کے وہی عناصر تو نہیں پائے جاتے تھے جو نمرود کے جھوٹے دعوے خدائی کے محرک تھے؟ اور کہیں یہی وجہ تو نہیں ہے کہ مجھے اپنی اس قسم کی جھوٹی بندگی کا کوئی اجر نہیں ملا؟

ماحصل یہ کہ جس طرح خدائی کا دعوے خدا کے قہر و غضب کا موجب بن سکتا ہے اسی طرح ریاکارانہ بندگی بھی اس کی ناراضگی اور ناخوشی کا سبب ہو سکتی ہے۔ یہ اشارہ بھی مضمر ہو سکتا ہے کہ پندار و نخوت وغیرہ کے جذبات سفلی صرف جھوٹے دعوے خدائی میں نہیں جھوٹے اظہارِ بندگی میں بھی رونما ہو سکتے ہیں۔ ایک دوسری جگہ غالب ہی نے کہا ہے ؎

اسد یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعوے ہے خدائی کا

سلہ مجھے یہی معنی پسند ہیں۔ — قریشی

۱۵

اس شعر کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ شاعر اپنے معشوق کو طعنہ دے کر کہتا ہے کہ کیا تیری مملکت حسن نمرود کی خدائی کے مترادف تھی جہاں بندگی کا کوئی صلہ نہیں ملتا تھا۔ دیکھ میں نے تیری اتنی بندگی کی، لیکن ہمیشہ ناکام اور نامراد ہی رہا۔

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

بظاہر غالب کا یہ شعر کچھ ایسا مشکل نظر نہیں آتا، لیکن اس کے معنے بیان کرنے میں شارحین کے درمیان بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ میں مختصراً ان کے اقوال نقل کرتا ہوں :-

جناب نظم طباطبائی ــــــــــــ

"یعنی شوق دل میں سما کر تنگیٔ جا کے سبب سے جوش و خروش نہیں کر سکتا گویا دریا گہر میں سما گیا کہ اب تلاطم باقی نہیں رہا۔"

مولانا حسرت موہانی اور جناب شوکت میرٹھی بہ تغیر الفاظ جناب طباطبائی کی شرح سے اتفاق کرتے ہیں۔

حضرت سہا ــــــــــــ

"غالب شوق یا عشق کی وسعت طلبی بیان کرتا ہے کہ دل کی وسعت اس وسیع جذبے کے لئے ناکافی ہے اور اس کی مثال میں دوسرا مصرعہ پیش کرتا ہے یعنی جس طرح موتی میں بوجہ عدم وسعت اضطراب دریا کی گنجائش باقی نہیں رہتی اسی طرح میرے دل محدود میں داعیات شوق و عشق کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔"

حضرت واجد دکنی ــــــــــــ

"شاعر نے اس شعر میں شوق کو دریا سے اور دل کو گہر سے تشبیہ

دی ہے، اور کہتا ہے کہ دریا یعنی شوق، گوہر یعنی دل میں محو ہو گیا۔ باوجود اس کے شوق تنگی جا کا گلہ مند ہے حالانکہ دل کی وسعت معلوم ہے...... اس شوق کو تمام زمین و آسمان کی گنجائش کافی اور مکتفی نہ ہوگی قائل کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا شوق بے حد و بے حساب ہے۔ اس شعر میں اپنے شوق کی وسعت و فراخی بیان کرتا ہے، مگر مرزا کا یہ طرز بیان اہل فصاحت کے پسند نہیں ہو سکتا۔"

حضرت تجدد دہلوی ــــــــــــ

"مرزا تعجب کے لہجے میں فرماتے ہیں کہ شوق کو تنگیٔ جا کا گلہ دل میں بھی ہے۔ یہ "بھی" کا لفظ بتا رہا ہے کہ دل ایسی وسیع چیز ہے کہ دونوں عالم اس میں سما جاتے ہیں اور پھر خالی رہتا ہے۔ باوجود اس وسعت کے شوق کو جگہ کی تنگی کا گلہ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ شوق کی وسعت بھی دل کی وسعت سے کسی طرح کم نہیں۔ اب تنگیٔ جا کا ثبوت ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں گہر میں دریا کی روانی محو ہو گئی یعنی کوزہ میں دریا سما گیا مگر بھنچ جانے کے سبب سے موجوں کی حرکت بند ہو گئی۔ دل کو گوہر اور شوق کو دریا سے تشبیہ دی ہے جو بالکل نئی تشبیہ ہے، سچ ہے اس مطلع میں دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے اور لطف یہ کہ چستیٔ بندش، تناسب الفاظ۔ طریق بیان میں فرق نہیں۔ دونوں مصرعے ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

حضرت نظامی بدایونی ــــــــــــ

"گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا۔ دریا گہر میں سما گیا۔ گوہر کو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہت دی ہے"

حضرت آثر لکھنوی :

"...... شعر کا حاصل یہ ہوا کہ جذبۂ شوق نے اپنی وسعت اور پنہائی کا اندازہ لگانا چاہا، پورے دل پر محیط ہو گیا، پھر بھی تسلی نہ ہوئی دل دریا ہے شوق اس دریا کا موتی ہے جس میں پورے دریا کا اضطراب بشکل موج گوہر جذب ہے۔ شوق پورے دریا پر محیط ہے۔ دریا کے تموج و طوفان (اضطراب) کو سمیٹے ہوئے ہے تاہم تنگیٔ جا کا شاکی ہے۔ گویا وسعت مکان ولامکان پر چھا جانا چاہتا ہے، بظاہر سعی طلب کی تمام منازل طے کر چکا ہے، تاہم قانع نہیں بلکہ اور ترقی کرنا اور آگے بڑھنا چاہتا ہے جو انسان کی فطرت کا بلند تقاضا ہے، کبھی قانع نہ ہونا کسی منزل پر دم نہ لینا"

حضرت نیاز فتحپوری :

"مفہوم یہ ہے کہ میرے شوق محبت کی شدت و وسعت کا یہ عالم ہے کہ دل ایسی چیز میں بھی (جو وسعت دو جہاں اپنے اندر رکھتا ہے) نہیں سما سکتا تھا لیکن مجبوراً اُسے دل کے اندر ہی سمانا پڑا۔ گویا یوں سمجھیے کہ ایک اضطراب تھا دریا کا جو گہر کے اندر بند ہو گیا"

جناب بیخود موہانی :

"مرزا کہتے ہیں کہ اضطراب دریا کو اضطراب شوق سے کیا نسبت؟

اضطراب دریا کی بساط صرف اتنی ہے کہ ادھر دریا (پانی) نے موتی کی صورت اختیار کی ادھر اس کا اضطراب کافور ہو گیا۔ اگرچہ موتی میں گنجائش ہی کتنی ہے۔ اس کے مقابلے میں اضطراب شوق کی وسعت دیکھیے کہ دل ایسے مقام میں بھی تنگی کا گلا کر رہا ہے، جس کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اس میں صرف کونین ہی نہیں جلوہ ہائے ربانی بھی سما سکتے ہیں "

میں خود جناب بیخود موہانی کی شرح سے متفق ہوں۔ بیشتر دیگر شارحین کے مطالب جو بخوف طوالت پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ جناب نظم طباطبائی اور حضرت نیاز فتحپوری کے مطالب سے ہم آہنگ ہیں۔ البتہ سلیم چشتی صاحب نے جناب بیخود موہانی کی تائید کی ہے۔

میرا خیال ہے کہ شوق اور دل کے ساتھ دریا اور گوہر کے مماثل الفاظ شعر میں آجانے سے بیشتر شارحین کا ذہن اس طرف رجوع ہو گیا کہ شاعر نے ان سے تشبیہ کا کام لیا ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ پہلے مصرعے میں وہ 'شوق کا گلہ'، 'دل میں تنگی جا' کا بیان کرتا ہے، اور دوسرے میں دریا کا اضطراب گہر میں ہونا، ظاہر کرتا ہے۔ ایک بے اطمینانی اور دوسری اطمینان کی صورت ہے۔ ان متضاد کیفیتوں کے باعث تشبیہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا۔

شاعر شوق اور دل کے مقابلے میں دریا اور گوہر کو صرف مثال کے طور پر پیش کرتا ہے اور چونکہ یہ تشابہات بھی ہیں لہذا لطف بیان میں اضافہ ہو گیا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ انسان کی تمنائیں اس کے دل میں

کبھی نچلی نہیں بیٹھتیں اور ہمیشہ دل کی وسعت کو بقدرِ حوصلہ نہ پاکر پراگندہ اور پریشان رہتی ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے دریا (پانی) جس میں ہر وقت تموج اور اضطراب کی سی کیفیت رہتی ہے کبھی سوتی بن کر بالکل ساکت اور ساکن بھی ہو جاتا ہے۔ بنیادی خیال یہ ہے کہ دریا ایسی ہر دم رواں اور دواں چیز کو تو قرار ممکن ہے لیکن انسان کے شوق کو نہیں۔ دل کے ساتھ "بھی" کا لفظ یہ اشارہ کر رہا ہے کہ دل کی وسعت کچھ ایسی حقیر نہیں ہے۔ اور کم سے کم وہ گھر سے تو زیادہ ہی ہے۔ انسان کے شوق کی فراوانی دریا کی مسلسل روانی سے بھی زیادہ ہے۔

(حاشیہ) "اس شعر کے ساتھ اگر یہ شعر پڑھا جائے تو مطلب پر مزید روشنی پڑے گی ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا　　دل بھی یارب کئی دیے ہوتے "

عرشی

ہنوز محرمی حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

شعر کے معنی صاف ہیں یعنی میں ابھی تک حُسن کا راز داں یا حقیقت آشنا نہیں بن سکا ہوں، اگرچہ میرے ہر بال کی جڑ ایک چشمِ بینا ہو کر اس کا نظارہ کر رہی ہے۔ مطلب یہ کہ میں بے شمار آنکھوں سے یا سرتا پا نگاہ ہو کر اُس کے حُسن کا تماشا کر رہا ہوں لیکن ابھی تک مجھے اس کی بارگاہ میں قربت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

آخر صاحب لکھنوی اس شعر کا نظیریؔ کے اس شعر سے

بزیرِ ہر بُنِ مو چشم روشنے ست مرا
بروشنائیِ ہر ذرّہ روزنے ست مرا

(میرے ہر بال کی جڑ کے نیچے میرے لئے ایک چشمِ روشن ہے
اور تیرے دیدار کے لئے ہر ذرّہ میرے لئے ایک کھڑکی ہے)

موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کیا غالب کا مصرع "کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا۔ نظیریؔ کے مصرعہ "بزیرِ ہر بُنِ مو چشم روشنے ست کا ناقص ترجمہ نہیں ہے؟ ناقص اس لئے کہ غالب نے بُنِ مو کو چشم بینا کہہ دیا اور نظیریؔ نے بزیرِ ہر بُنِ مو کہہ کر چشم روشن کو نوک پلک سے بھی درست کر دیا۔"

درحقیقت غالب کا مصرع نظیریؔ کے مصرع کا ترجمہ بالکل نہیں ہے اور غالباً اسی وجہ سے اُسے ناقص ترجمہ قرار دیا گیا ہے جو مقتضائے انصاف

انصاف نہیں ہے۔ ایک عامتہ الورود مضمون کو دونوں ہی شعرا نے بحر اور قافیوں کی پابندی کے ساتھ اپنے اپنے طرز سے ادا کیا ہے۔

غالب نے بنِ مو کو چشم بینا کہہ دیا تو نہیں معلوم کیا قباحت ہوگئی اور نظیری نے ذرّے کو روزن کہہ دیا تو کوئی عیب نہیں سمجھا گیا۔ غالب کے مصرعہ ثانی کے یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں "میرا رویاں رویاں چشم بینا کا کام کر رہا ہے" غالب کی 'چشم بینا' کو نظیری کی 'چشم روشن' پر جو فوقیت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن جس طرح غزل کی بحر اور روزن کی بنا پر غالب صرف بنِ مو کہنے پر مجبور تھے، اسی طرح نظیری کے لئے بھی قافیہ کے لحاظ سے چشم روشن کہنا ناگزیر تھا اور یہ کوئی محل اعتراض نہیں ہوسکتا۔

اثر صاحب آگے فرماتے ہیں "غالب اور نظیری کے اشعار متحد المفہوم ہیں۔ غالب نامحرمیِ حسن کا اعتراف کرکے ٹھہر جاتے ہیں لیکن نظیری شوق نظارہ کے ساتھ کثرتِ جلوہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ روزن کسی مکان میں ہوتا ہے، اُس حریم قدس کا کیا ٹھکانا جس میں ہر ذرہ ایک روزن کا کام دے۔ نیز اُس شوق کی کیا انتہا ہے کہ ہر بنِ مو چشم روشن بن جائے۔ چونکہ ہر ذرہ کو تابندہ کہا اور روزن سے استعارہ کیا، لہذا معلوم ہوا کہ نور ہنوز ہر ذرے کے روزن سے چھن چھن کے مشتاقوں کو دعوت نظارہ دے رہا ہے۔ یہ روزن بے شمار اور عشق کا تقاضا تھا کہ ہمہ تن چشم مو بن کر ہر روزن سے گل چینی جمال کرو، جو ناممکن ہے، لہذا شوق بدستور تشنہ رہتا ہے ضمناً یہ بات بھی نکل آئی کہ حسن کی مکمل معرفت محال ہے اسی گوشے کو

نظیری کے مصرعہ سے مستعار ہے کہ غالب نے اپنے شعر کی کائنات بنایا، تاہم نظیری کی منقصت کی جاتی ہے اور غالب کو بڑھایا چڑھایا جاتا ہے۔ خدا کی قدرت ہے، اور کیا کہا جائے۔"

دونوں اشعار زیر بحث کو سخن فہمی سے دیکھا جائے تو وہ متحد المفہوم ہرگز نہیں ہیں۔ آثر صاحب کا غالب پر خاص اعتراض یہ ہے کہ وہ نامحرمیِ حسن کا اعتراف کر کے ٹھہر جاتے ہیں، لیکن نظیری شوق نظارہ کے ساتھ کثرت جلوہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ نظیری کا پہلا مصرع

بزیر ہر بنِ مو چشم روشنے ست مرا

صرف شوقِ نظارہ ظاہر کرتا ہے۔ اور دوسرے مصرع

بروشنائی ہر ذرہ روزنے ست مرا

میں بھی زیادہ زور شوق نظارہ ہی پر ہے۔ صرف ثانوی پہلو کثرتِ جلوہ کا نکلتا ہے۔ خیر اس سلسلے میں آثر صاحب ہی کا قول تسلیم کر لیا جائے کہ "اس حریم قدس کی وسعت کا کیا ٹھکانا ہے جس میں ہر ذرہ ایک روزن کا کام دے" تو بھی اس سے یہ بات کیسے پیدا ہوئی کہ "روزن بے شمار اور عشق کا تقاضا کہ ہمہ تن چشم مو بن کر ہر روزن سے گل چینی جمال کر دو ناممکن ہے، لہذا شوق بدستور تشنہ رہتا ہے، ضمناً یہ بات بھی نکل آئی کہ حسن کی مکمل معرفت محال ہے" یہ تو وہی بات ہوئی کہ سہ

کس کو باغ میں جانے نہ دینا
کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

نظیری کے شعر سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ گل چینی جمال ناممکن ہے
شوق بدستور تشنہ رہتا ہے اور حسن کی مکمل معرفت محال ہے بلکہ اس کے
برعکس یہ مطلب بالکل سامنے کا ہے کہ نظارے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود
ہے، مواقع کی بھی کمی نہیں کیونکہ بے شمار کھڑکیاں کھلی ہوئی ہیں۔ لہذا
اس سے ضمناً اگر کوئی بات نکالی بھی جا سکتی ہے تو صرف یہ کہ خوب جی بھر کر
گل چینی جمال کر رہا ہوں۔ آخر صاحب کی رائے میں یہ صورت حال ناممکن
بلکہ محال ہے لہذا اس کی روشنی میں نظیری کا شعر معلق اور پیچیدہ ہو کر رہ جاتا ہے
سمجھ میں نہیں آتا کہ غالب کے شعر میں "کثرت جلوہ، کی کیا کمی
رہ جاتی ہے" اس حریم قدس کی وسعت کا کیا ٹھکانا! جس کا نظارہ
ہر ٹنے مو کر رہا ہے، لیکن 'ہنوز' محرمی حسن کو ترس رہا ہوں۔ خود
غور فرمائیے جس کے تماشائی کا یہ حال ہو اس تماشے کا کیا کہنا۔ وہ لامحدود
اور بے پناہ نہیں تو اور کیا ہے؟ وہ ذرّوں کے جھروکوں سے محصور نہیں
بلکہ ساری کائنات پر محیط ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ غالب نے نہ صرف وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو نظیری
نے کہا تھا بلکہ اس میں قابل قدر اور بہت ضروری اضافہ کر کے اسے
بہت دلآویز اور معنی خیز بنا دیا ہے۔ الفاظ کا انتخاب 'ہنوز' 'محرمی حسن'
'ترستا ہوں' داد سے مستغنی ہے۔ نظیری نے صرف تصویر کھینچی تھی۔
غالب نے تصویر کو زبان بھی دے دی۔ نظیری کا شعر صرف 'شاعرانہ
تعلی' ہے۔ اور غالب کا شعر 'ترجمانِ حقیقت' اور پھر دونوں کے

طرز ادا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

(حاشیہ) آپ نے درست فرمایا کہ یہ دونوں شعر متحد المضمون نہیں ہیں۔
نظیریؔ اپنے آپ کو "محرم حسن" بتاتا ہے۔ اور غالبؔ "نامحرم حسن"۔

عرشی

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا

گنجینۂ تحقیق میں حضرت بجنوؔد موہانی نے اس شعر کی شرح کی ہے
اور واقعہ یہ ہے کہ حق شرح ادا کر دیا ہے۔ میں اُسے اختصار کے ساتھ یہاں
درج کرتا ہوں ۔

"اس شعر میں کئی ٹکڑے معنی خیز ہیں ـــــــــــــ

میں اور :۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ میکش دھادت کا پینے والا ہے۔
اس کے نفضائل رندانہ سے ساقی اور رندوں کا سارا گروہ خوب
واقف تھا....... جسے شراب نہ ملنے کی تکلیف کے ساتھ ساتھ
رندوں میں اپنی بے آبروئی پر چشمکیں ہونے کی بھی اذیت ہے ۔

بزمِ مے :۔ اس ٹکڑے نے بھی معنیِ شعر میں زور پیدا کر دیا ہے۔
اگر تنہائی میں ساقی نے یہی برتاؤ کیا ہوتا تو ناگوار ضرور ہوتا،
مگر نہ اتنا ۔

یوں :۔ اس سے سُننے والے کی نظر میں ایسے رندنا کام کی تصویر پھر جاتی
ہے جسے اپنی ناکامی پر انتہا کا ملال، حد کا غصہ ہو، اور تکلیف
خمار جس کی جان لیئے لیتی ہو ۔

تشنہ کام :۔ اس سے حلق وزبان کے کانٹوں کا تصور ہونے لگتا ہے
جو شدتِ تشنگی کا ترجمان ہے ۔

اوّل :- اس بزم شراب میں تشنہ کام مگر دل میں اُمید لیئے ہوئے جانے اور لب تشنہ اور دلِ مایوس لیئے ہوئے پلٹنے کی حالت آئینہ ہو جاتی ہے۔
دوسرے مصرع میں کہتا ہے کہ میں نے تو شراب اس لئے نہ مانگی کہ توبہ کر چکا تھا، آخر ساقی نے ضیافت کیوں نہ کی، یعنی اس ظالم کی سمجھ میں کیوں نہ آیا کہ رندوں کی توبہ ہی کیا۔ اور اگر اُسے پینا نہ ہوتا تو رندوں کے جھگڑے میں آتا ہی کیوں۔ ہمارا مقصد یہی تھا کہ توبہ کی لاج رہے اور رند پلا دیں، یہاں رندوں کا ذکر کیا، ساقی کم بخت نے بھی جھوٹوں نہ پوچھا اور ظالم کی زبان سے اتنا بھی نہ نکلا کہ اجی پیتے بھی جاؤ۔
ساقی کو کیا ہوا تھا ؟ اس کے بہت سے مفہوم ہو سکتے ہیں، صرف لہجے میں تغیر پیدا کرنے کی ضرورت ہے ۔
کیا اس نے بھی توبہ کی تھی ؟
حیرت ہے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی !
اس پر میرا احترام واجب تھا !
اللہ ری بے دردی، اللہ ری سنگ دلی !
رندوں کی حالت کا صحیح اندازہ رکھتے ہوئے ایسی غلطی !
کیا مجھے دیکھا نہیں ؟
کیا میرے توبہ کرنے پر خفا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ "
مجھے اس شرح کے متعلق صرف ایک بات عرض کرنا ہے ۔ دوسرے مصرعہ کے اس ٹکڑے میں "گر میں نے کی تھی توبہ"۔ لفظ "گر" بڑا معنی خیز

اور پُر لطف ہے۔ اس سے شاعر کا توبہ کرنا یقینی نہیں بلکہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور شعر کے مفہوم میں ایک اور ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔

شاعر بزم مے تک بڑی آس لگا کر پہونچتا ہے لیکن وہاں کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ بڑی مایوسی سے تشنہ کام واپس آتا ہے۔ اب وہ سوچتا ہے کہ ممکن ہے کہ کسی نے ساقی کے یہ کان پھونک دیے ہوں کہ میں شراب پینے سے توبہ کر چکا ہوں لیکن یہ وجہ بھی معقول نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ میں توبہ کر چکا تھا تب بھی ساقی کا فرض تو یہی تھا کہ وہ مجھے شکست توبہ کی دعوت دیتا۔ آخر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا۔ یہاں مگر کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں۔

اگر ۔ اچھا، یہ مان بھی لیا جائے کہ، بفرض محال، ساقی کو یہی اطلاع ملی تھی کہ، وغیرہ وغیرہ۔

شاعر ساقی کی شکایت کرنے سے پہلے اس ممکن صفائی کو رد کر دیتا ہے جو ساقی کی طرف سے پیش کی جا سکتی ہے۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ شاعر نے واقعی توبہ کر لی تھی بلکہ صرف یہ کہنا مقصود ہے کہ اگر ساقی کو اس قسم کی بھی اطلاع ملی ہوتی تب بھی اُسے میرے ساتھ اس قسم کا برتاؤ نہ کرنا چاہئے تھا۔

یہ شعر قادر الکلامی اور حسنِ بیان کا ایک نادر نمونہ ہے۔ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مضمون ادا کیا گیا اور کوئی بات بھی مبہم نہیں ساتھ ہی ساتھ نہ صرف کوئی لفظ بھی بھرتی کا نہیں ہے بلکہ ہر لفظ اور

ٹکڑے سے دوسرے کو زور ہیو بخ رہا ہے۔

بعض حضرات نے غالب کے اس شعر کو بیگی دختر امیر علی جلائر کے اس شعر کا چربہ بتایا ہے ؎

من اگر توبہ زمے کردہ ام، اے سرو سہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے نہ دہی

دونوں اشعار ایک عامۃ الورود مضمون کو بیان کرتے ہیں لہذا اس کے لئے عکاسی، خوشہ چینی یا توارد کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ایسے چلتے پھرتے اور بالکل سامنے رکھے ہوئے مضامین کے سلسلے میں دیکھنا یہ نہیں ہوتا ہے کہ مرکزی خیال کیا ہے، بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ کس طرح کہا ہے اور مرکزی خیال میں کون سے نئے پہلو نکالے ہیں۔

بیگی کا اندازِ بیان بالکل سیدھا سادا ہے۔ اور پہلے مصرع میں سرو سہی کے الفاظ بھرتی کے معلوم ہوتے ہیں۔ غالب اپنے شعر میں ایک ڈراما ئی فضا پیدا کر دیتے ہیں اور ہر ہر لفظ اور ٹکڑے سے بنیادی خیال میں کئی لطف انگیز پہلوؤں کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ کہاں صرف "تو خود ایں توبہ نہ کردی" کی مضمحل سی شکایت اور کہاں "ساقی کو کیا ہوا تھا؟" جیسا پہلو دار معمہ! بیگی نے جو کچھ کہا ہے وہ غالب نے صرف اپنے مصرعۂ ثانی میں اس سے کہیں بہتر انداز میں کہہ دیا ہے۔ مصرعۂ اولیٰ میں جو کچھ کہا ہے اور بہت ہی خوب کہا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔

ذرّہ ذرّہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلا آشنا

ساغر :۔ پیالہ جس کی خاصیت گردش میں آنا ہو۔
میخانۂ نیرنگ :۔ میخانۂ طلسم، مراد گردشِ ایام، انقلابِ زمانہ۔
چشمک :۔ اشارہ۔

حضرت آثر لکھنوی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے اور واقعی بہت خوب کی ہے :۔

"غالب کا یہ شعر اُن کے انفرادی رنگ اور تخیل کی نادر کاری کا آئینہ دار ہے۔ دنیا کو باعتبار تغیرات و فنا آمادگی میخانۂ نیرنگ اور ذرّوں کو جو تغیر و فنا کی نشانیاں ہیں ساغر میخانۂ نیرنگ کہنا، پھر اس طلسم آبادی و ویرانی کو گردشِ مجنوں سے تعبیر کرنا اور چشمکہائے لیلیٰ (اشارۂ مشیت) کا راز داں کہہ کر جوشِ رقص و مستی و میخانہ آرائی دکھا دینا اور لفظ چشمک لا کر تال و سم پیدا کر دینا حسنِ تخیل و جولانیِ فکر کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ شعر میں حکمت و فلسفہ و تصوف کا وہ بدیع امتزاج ہے کہ شاید و باید۔"

صاف الفاظ میں شعر کا مفہوم یہ ہے کہ اس کارخانۂ عالم میں ایک ایک ذرّہ انقلاب آمادہ ہے لیکن یہ کوئی نزاجی کیفیت نہیں ہے بلکہ اس کے پسِ پردہ مشیت کی شہ کارفرما ہے بالکل اُسی طرح جیسے

مجنوں کی گردش کے محرک لیلےٰ کے اشارے ہوتے تھے ۔

ذرّے کو ساغر سے جس کی خاصیت گردش کرنا ہے تعبیر کیا ہے اور اور اسی کی رعایت سے کارخانۂ عالم کو میخانہ کہا گیا ہے اور محض ان دو الفاظ کے استعمال سے شعر میں کیف و مستی کا انداز پیدا ہو گیا ہے ۔ جس طرح میخانے میں ساغر گردش میں رہتا ہے اُسی طرح کارخانۂ عالم کا ایک ایک ذرہ بڑے والہانہ انداز سے گردش میں رہتا ہے یعنی اس میں ہمہ وقت مسلسل اُلٹ پھیر ہوتی رہتی ہے ۔ لیکن یہ کیفیت انتشاری یا نراجی نہیں ہے بلکہ اس میں ایک منتظم قانون قدرت چھپا ہوا ہے بالکل اُسی طرح جیسے رقصِ مجنوں میں ، جو بظاہر دیوانگی معلوم ہوتی ، کچھ ادھر کا بھی اشارہ یعنی لیلےٰ کی شہ اور ہمت افزائی موجود تھی ۔ گردشِ مجنوں اور چشمکہائے لیلےٰ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ دنیا کا ہر ذرّہ نہ صرف تابع مشیت ہے بلکہ دل و جان سے اس کا شیدائی اور فدائی بھی ہے ۔ ندرتِ خیال ، حسنِ بیان اور انتخابِ الفاظ داد سے مستغنی ہے ۔ شاعر نے بڑی چابک دستی سے کئی حسین مرقعے کھینچ دیے ہیں ، مے خانے میں ساغر کی گردش ، لیلیٰ کی چشمک پر مجنوں کا رقص ، ذرّے یعنی کارخانۂ عالم کی ہر چیز میں تغیر و تبدل یا اس کا منقلب ہوتے رہنا لیکن قانون قدرت کے ضبط و نظم کے ساتھ ، دیوانگی میں ہشیاری اور اس طرح ایک نازک خیال اور لطیف نکتے کو بڑی دلآویز تشبیہوں اور استعاروں کے گلدستے میں پیش کیا گیا ہے ۔ معنی کی وسعت اور الفاظ کی

قلت شاعر کی قادرالکلامی کا بیّن ثبوت ہے۔

"گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلیٰ آشنا" خود کتنا اچھا خیال اور انداز بیان ہے اور پھر جب اس سے کارخانۂ عالم کے انقلابات میں قانون قدرت کی کار فرمائی مراد لی جائے اور جس کے لئے ذرّے ذرّے کو ساغرِ میخانۂ نیرنگ کہا جائے تو یہ صرف شاعری نہیں سحر طرازی اور معجز بیانی ہو جاتی ہے۔

انقلاب روزگار پر غالب کے غیر متداول کلام میں ایک شعر ہے ؎

خوشی، خوشی کو نہ کہہ، غم کو غم نہ جان اسؔد
قرار داخلِ اجزائے کائنات نہیں
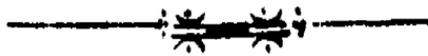
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

مولانا حالی نے اس شعر کے دو مطالب بیان فرمائے ہیں۔

(۱) جس دشت میں ہم ہیں اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے۔ یعنی خوف معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھتے تھے کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔

آثر لکھنوی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے:۔

"مجھے وحشت میں ایسے مقام کی تلاش ہوئی جو گھر سے زیادہ ویران ہو لہذا دشت کا رُخ کیا وہاں پہونچ کر یہ اندازہ ہوا کہ یہ ویرانی تو کچھ بھی نہیں اس سے زیادہ تو میرا گھر ویران تھا۔"

آثر لکھنوی نے واقعی ایک بالکل نئی بات نکالی ہے:۔

"اگر شعر میں 'ویرانی سی ویرانی ہے'، کے پیشتر لفظ 'کوئی'، نہ ہوتا تو بے شک شدت کی ویرانی کا مفہوم نکلتا مگر لفظ 'کوئی'، نے شدتِ ویرانیِ دشت کی تنکیر و تنقیص کر دی۔"

اس شعر میں شاعر کا بنیادی مقصد اپنے گھر کی بے پناہ ویرانی ظاہر کرنا ہے، وہ کہتا ہے کہ میرا گھر اس قدر ویران ہے کہ اس کے مقابلے

میں دشت کی ضرب المثل ویرانی بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اثر صاحب کے بیان کردہ معنی کے پیش نظر اس شعر کو ذومعنی قرار دینا صحیح نہیں ہے کسی شعر کے ایک سے زائد مطالب اسی وقت قابل قبول ہو سکتے ہیں جب کہ دونوں قریب قریب ہم پلّہ ہوں ورنہ اگر ایک مطلب دوسرے سے ہر حیثیت سے فوقیت رکھتا ہو تو صرف اسی کو قبول کرنا چاہیئے اور اگر یہ معیار پیش نظر نہ رکھا جائے تو پھر کھینچ تان کر ہر بات کے ایک سے زائد مطالب نکالے جا سکتے ہیں۔

نیاز فتحپوری صاحب نے اپنی کتاب مشکلات غالب میں ارشاد کیا ہے کہ اگر پہلے مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا ہو سکتا ہے کہ "دشت کی ویرانی بھی کوئی ویرانی ہے" تو بے شک گھر کی ویرانی دشت سے بڑھ جاتی ہے لیکن لفظ "سی" نے یہ مفہوم پیدا نہ ہونے دیا" یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ لفظ "کوئی" کی موجودگی میں صرف لفظ 'سی' اس مفہوم کے پیدا کرنے میں کیوں مانع ہے؟ غالباً نیاز صاحب کے خیال میں اس مفہوم کے لئے مصرعہ اولیٰ یوں ہونا چاہیئے تھا "کوئی ویرانی میں ویرانی ہے"

اس شعر کا مطلب بیان کرنے میں اثر صاحب نے لفظ 'کوئی' پر زور دیا ہے، اور نیاز صاحب نے لفظ 'سی' پر اور اس وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے سے متضاد نتیجہ نکالا ہے۔

دشت کی ویرانی کی ہیبت میں گھر کا یاد آنا عاشق کی کمزوری ظاہر

کرتا ہے۔ برخلاف اس کے یہ بات کہ عاشق نے اپنے ہاتھوں اپنے گھر کو ایسا ویران کر رکھا ہے کہ اب اس کے مقابلے میں اُسے دشت کی ویرانی بھی ہیچ نظر آتی ہے اُس کے جنون کی شدت واضح کرتی ہے لہذا اغلب یہی ہے کہ شاعر صرف یہی کہنا چاہتا تھا۔

اسی موضوع پر مومن کا شعر ہے ؎

جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں
کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
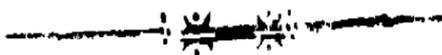
پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

یہ بظاہر آسان اور نہایت سادہ شعر رمز اور اشاریت کی ایک بہترین مثال ہے۔ بہت کم اشعار کو وہ قبولیت عام حاصل ہوئی جو اس کو ہے۔ زبان زدِ عام ہو کر یہ اب ضرب المثل کے مرتبے پر فائز ہے۔ اس کے کئی مفہوم ہو سکتے ہیں بخوفِ طوالت صرف اشاروں پر اکتفا کیا گیا ہے۔

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟ ————

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں یا اس طرح پوچھ کر وہ مجھے چھیڑتے ہیں۔

دوسروں سے پوچھتے ہیں یا پوچھتے رہتے ہیں یا بھری محفل میں ایسا ناموزوں سوال کر بیٹھتے ہیں۔

بالآخر میرے جذبۂ عشق نے اپنا اثر دکھایا اور وہ بھی پوچھنے پر مجبور ہوئے۔

دوسروں کے منھ سے میرا تذکرہ سُن سُن کر انھیں بھی یہ معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔

ہم ان پر اپنا سب کچھ لُٹا چکے اور انھیں ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم۔

اُن کی بدولت میری صورت اور حالت میں وہ تبدیلی پیدا ہو چکی ہے کہ اب وہ خود پہچان نہیں پاتے۔

اللہ ری بے اعتنائی کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم ۔
کوئی اور نہ جانتا تو بات بھی تھی لیکن وہ نہیں جانتے ! (اگر لفظ وہ
پر زور دیا جائے)
اتنا بے ننگ و نام ہوں کہ وہ مجھے جانتے بھی نہیں ۔
نفرت یا غصے سے پوچھ رہے ہیں ۔
حُسن تغافل تو دیکھو ۔
سب کے سامنے کیا شرمندہ کر رہے ہیں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا ؟ ——————
ایسے سوال کا جواب ہی کیا ہو سکتا ہے ؟
جب جان بوجھ کر نادان بن رہے ہیں تو ہم ان کے سوال کا جواب
کیا دیں ۔
کوئی ایسا جواب بتاؤ جس سے وہ خوش ہو جائیں یا جو اُن کی ناراضگی
کا باعث نہ ہو ۔
ہم مارے شرم کے یا حیرت زدہ ہو کر جواب دینے سے قاصر ہیں ۔
اُن کی معصومیت یا سنگ دلی یا ستم ظریفی تو دیکھو کہ خود مجھی سے مجھ کو پوچھ
رہے ہیں۔ کوئی بتاؤ کہ ان کے ایسے عجوبہ سوال کا جواب کیا ہو سکتا ہے ؟
اب ہمیں انھیں کیا بتائیں کہ ہم کون ہیں ؟
ہماری کم ظرفی ہو گی اگر ہم بتا دیں کہ ہم ان کے لئے کیا کیا پاپڑ بیل
چکے ہیں ۔

اس شعر کو پڑھنے میں بعض صرف لہجے کے تغیر سے معنی کہیں سے کہیں پہونچ جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس شعر کے مقابل میں نعمت خان عالی کا یہ شعر پیش کیا جاتا ہے ؎

ز مردم یاری پرسد کہ "عالی کیست؟" طالع بیں

کہ عمرم در محبت رفت و کار آخر رسید اینجا

غالب کے شعر کے پہلے مصرعہ کے جو کئی مطلب بیان کئے گئے ان میں سے صرف ایک اس شعر کا بھی مفہوم ادا کرتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں جو کچھ ہے وہ قطعاً اس کے علاوہ ہے۔ عالی کا شعر بہت اچھا ہے لیکن غالب کے شعر سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ایک چیز ہی دوسری ہے۔ "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟" کا ٹکڑا لاجواب ہے۔ اس میں مایوسی، مزاح، تعجب، حسرت، محبت سبھی کچھ تو نظر آتا ہے۔ عالی سمجھا سمجھا کر جو مطلب دو مصرعوں میں نکالا ہے اُسے بلکہ اس سے بہتر کو غالب نے بڑی چابکدستی سے صرف ایک مصرعہ میں ادا کر دیا ہے۔ غالب کا یہ شعر قلیل الالفاظ اور کثیر المعنی کی ایک نادر مثال ہے۔

(حاشیہ) "غالب کے پہلے مصرعہ میں لفظ غالب کو تخلص نہ قرار دیا جائے، تو ایک مطلب یہ بھی نکلتا ہے کہ بتاؤ ہم تم میں کون غالب ہے دوسرے پر یعنی عشق و حسن میں کس کو غلبہ حاصل ہے، اب اگر جواب میں کہا جائے کہ میں غالب ہوں، تو یہ بات مناسب نہیں، اور دوسری شق واقعہ کے خلاف ہے۔"

(عرشی)

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یا رب ؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا!

شاعر خدا سے فریاد کرتا ہے کہ یا رب تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے جب کہ سارا دشت امکاں محض اس کے ایک نقشِ پا کی حیثیت رکھتا ہے۔ حاصلِ شعر یہ ہے کہ انسان کی تمنا کے مقابلے میں امکانات کا میدان بہت تنگ ہے، اور وہ ہمیشہ اسے پیچھے چھوڑتی رہتی ہے۔

انسان اپنے فطری تجسّس کی بنا پر ہمیشہ اُن باتوں کی تمنا کرتا رہتا ہے جو بظاہر دائرۂ امکان سے باہر معلوم ہوتی ہیں۔ تمنا کے محرک امکانات نہیں ہوتے کیونکہ ان کا حصول دشوار بھلے ہی ہو، ناممکن ہرگز نہیں ہوتا، اور انسان کی جدت پسند اور انقلاب انگیز افتادِ مزاج ہمیشہ ناممکن کو ممکن بنا دینے پر تُلی رہتی ہے اور پھر جب وہ ایک ناممکن چیز کو ممکن بنا چکتا ہے تو وہ دوسری ناممکن چیز کو ممکن بنانے میں لگ جاتا ہے۔ اس کے اس راستے میں اس کی کوئی منزل نہیں ہے اور وہ اپنی فتوحات کے جلو میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔

کل تک جو باتیں دائرۂ امکان سے باہر سمجھی جاتیں انسان نے اپنی کوششوں سے آج انھیں ممکنات بنا دیا ہے لیکن اس پر بھی انسان کو قرار نہیں، دائرۂ امکان میں وسعت ہو رہی ہے تو اُسی مناسبت سے انسان کے حوصلوں میں بھی ترقی ہو رہی ہے اور اُن کا افق دور سے

دور تر ہوتا جا رہا ہے۔ انسان کی خواہشیں ہمیشہ دائرۂ امکان سے آگے ہی رہتی ہیں۔ شاعر انسان کے اس بے پناہ جہد مسلسل کو دیکھ کر تعجب میں خدا سے پوچھتا ہے کہ انسان کی ہر دم رواں دواں فطرت کا منتہائے مقصد کیا ہے؟ وہ آخر چاہتا کیا ہے؟ سارا دائرۂ امکان تو اس کی تمنا کے صرف ایک نقشِ پا کی حیثیت رکھتا ہے پھر اس لامحدود تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے؟ بڑا بلیغ اور فکر انگیز شعر کہا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح کہنا صرف غالب ہی کا حصہ ہو سکتا ہے۔

دائرہ امکان کو مسخر کر کے انسان اور آگے بڑھنے کی تمنا کس طرح کرتا ہے اس کے لئے صرف ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک صدی قبل انسان کا ہوا میں اُڑنا دائرۂ امکان سے باہر سمجھا جاتا۔ تب انسان ہوا میں اُڑنے کی تمنا کیا کرتا۔ وہ ہوا میں اُڑنے لگا اور یہ بات دائرۂ امکان میں آگئی تو وہ چاند اور مریخ تک پہونچنے کی تمنا کرنے لگا ہے، اور جب یہ بات بھی دائرہ امکان میں آجائے گی تو وہ دوسرے ستاروں تک پہونچنے اور ان پر نو آبادیات قائم کرنے کے منصوبے بنانے لگے گا، اور اسی طرح اس کی خواہشیں ہمیشہ دائرۂ امکان کو پیچھے ہی چھوڑتی رہیں گی۔

غالب نے 'دشت امکان' کو 'تمنا کا نقشِ پا' بہت خوب کہا ہے۔ تمنا میں ہمیشہ امکانات کو روند کر ممکن سے ناممکن کی جانب بڑھتی رہتی ہیں، انسان کبھی چین سے نہ بیٹھنے والی فطرت اور اس کی کاوش لامتناہی کا اعتراف بڑے دلنشین انداز سے کیا گیا ہے۔ یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام میں ہے۔

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرّہ آہ کا
یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔ شعر اپنی معنویت کے علاوہ اپنے الفاظ کے حسن کے باعث بڑا لطیف اور جمیل ہے۔ آہ کا ذرہ، طاؤس در رکاب، اور نفس کو غبار کہنا غالب ہی کا حصّہ ہے۔ ندرت تخیل اور قدرت بیان کا ایسا حسین امتزاج مشکل سے دیکھنے میں آتا ہے۔ غالب نہ صرف ایک بلند پرواز فلسفی بلکہ ایک عظیم المرتبت حسن کار بھی تھے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری آہ کا ہر ذرہ اپنے ساتھ طاؤس لئے ہوئے ہے طاؤس اپنے پروں کی رنگینی اور دیدہ زیبی کے لئے ضرب المثل ہے۔ مراد یہ ہے کہ میری آہ میں تمام تر رنگینیاں بھری ہوئی ہیں۔ یارب! میرا نفس کیسی جلیل القدر بارگاہ حسن کا غبار ہے کہ جس کی بنا پر میری آہ میں بھی ایسی دلکش رنگ آمیزی ہو گئی ہے۔

شعر کا حاصل یہ ہے کہ اس بارگاہِ حسن کی شان دلربائی کا کیا پوچھنا کہ جس کی حسرت میں اگر میں آہ بھی بھرتا ہوں تو وہ بھی رنگین نظر آتی ہے نفس کو جلوہ گاہ کا غبار بہت خوب کہا ہے۔ جلوہ گاہ ایسی پاکیزہ ہے کہ وہاں اگر کسی چیز کو غبار کہا جا سکتا ہے تو دیکھنے والوں کے نفس (سانس) کو۔ وہاں کی پاک اور صاف فضا میں یہی ایک ملوث کرنے والی چیز ہو سکتی ہے۔

۸۴

"آہ" بھرنا سانس لینے ہی کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ سانس میں
ذرات بھی ہوتے ہیں اور خوردبین سے دیکھنے پر ان میں طرح طرح
کے رنگ بھی پائے جاتے ہیں۔ ذرّے کی رنگینی ظاہر کرنے کے لیئے
اُسے طاؤس دررکاب کہنا حسنِ بیان کا ایک نادر کرشمہ ہے۔

ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کار اسد
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام میں ہے۔ شاعر نے ایک بڑی نازک بات بڑے تیکھے انداز میں کہی ہے۔ رشک، مایوسی اور اُمید کے جذبات کو سمو کر ایک ایسے انسان کی جو ناکامیوں اور نامرادیوں کی آندھیوں کے درمیان بھی اپنی اُمید کا چراغ جلائے بیٹھا ہو بڑی پُر درد تصویر کھینچ دی ہے۔

شاعر دیکھتا ہے کہ رات میں پروانے کو شمع کا قرب حاصل ہے اور دن میں بلبل پھول سے ہمکنار ہے۔ وہ ان عشاق کی مستقل سرشاریوں کا اپنی دائمی محرومیوں سے مقابلہ کرتا ہے تو اس کا دل کڑھتا ہے اور وہ اپنی عاشقی کی ایک سُبکی سی محسوس کرتا ہے مگر اپنی مایوسیوں کے اس خاکستر میں وہ ایک اُمید موہوم کی چنگاری بھی دبائے بیٹھا ہے۔ کہ شاید اس کا معشوق بھی اس پر مہربان ہو کر کبھی اس کے پاس آجائے لہٰذا وہ "شب پروانہ" اور "روز عندلیب" کو مخاطب کرکے کہتا ہے کہ میری سرشاریوں کا زمانہ شاید کسی دوسرے وقت کے لئے ملتوی کر دیا گیا ہے لیکن خیر وہ کبھی نہ کبھی آئے گا ضرور!

بالکل وہی بات ہے جیسے کسی امیر باپ کے بچے کا نیا کھلونا دیکھ کر کوئی غریب باپ کا بچہ کہے عجب ہمارے ابا آئیں گے تو وہ بھی ایسا ہی

کھلونا ہمارے لئے لائیں گے" یا اس معصومیت اور سادہ لوحی پر کس کو پیار اور ترس نہ آجائے گا؟

شاعر نے "شب پروانہ" اور "روز وصال عندلیب" کو صرف مخاطب کر کے ایک طویل مضمون کو جو کسی دوسری صورت سے ایک شعر میں آ ہی نہیں سکتا تھا ادا کر دیا ہے۔ محض اس اشارے نے یہ مفہوم ادا کر دیا کہ رات میں پروانہ شمع کے پاس اور دن میں بلبل پھول کے قریب موجود رہتی ہے اور شاعر کو اپنے ہی جیسے عاشقوں کی یہ خوش قسمتی دیکھ کر رشک ہو رہا ہے۔

ہوں داغ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار
نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج

اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کو پیچیدہ نفسیاتی تجربات میں کتنی بڑی دسترس تھی۔ جس مسئلہ پر کوئی ماہرِ نفسیات پورا ایک مضمون لکھتا اُس کو انھوں نے صرف ایک شعر میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ بحیثیت شاعر ان کے اظہار بیان کا یہی ایک ذریعہ ہو سکتا تھا۔

اس شعر میں شاعر ایک ایسے شخص کی نفسیات کی عکاسی کر رہا ہے جس کی ساری عمر ناکامیوں اور محرومیوں میں بسر ہوئی ہے۔ وہ اچانک اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ ایسے غیر متوقع موقع پر وہ بجائے اپنی خوشی سے لطف اندوز ہونے کے، اس اندیشے میں کہ اس کی یہ خوشی اس سے بہت جلد چھن جائے گی، پہلے سے بھی زیادہ غم زدہ ہو گیا ہے ؎

گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں

اپنی غم آشنا فطرت کے باعث وہ اپنی خوشی سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اس شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ وہ اس کو غارت کر دینے پر تلی ہوئی ہے۔

وصالِ یار کی شام آئی تو عاشق کو حد درجہ خوش ہونا چاہیے تھا لیکن

آج ہی اُسے چراغ بزم کی روشنی سے صبح کی علامتیں جھلکتی دکھائی پڑ رہی ہیں صبح اور چراغ میں روشنی مشترک ہے۔ لہٰذا عاشق اپنی شامِ وصال کو "نیم رنگی" سے تعبیر کرتا ہے یعنی پورے طور سے اُسے شام ہی نہیں مانتا اور جب سرِ شام ہی صبح کے آثار نمایاں ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ایسی شامِ وصال سے کوئی کیا حظ اٹھا سکتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے عاشق پہلے سے بھی زیادہ افسردہ ہو گیا ہے۔ خوشی میسر بھی ہوئی تو غم اس کا نقیب بن کر آیا۔ اس کا آغاز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ انجام سامنے آ گیا۔

ایک ناکام اور نامراد انسان یہی سوچتا ہے کہ ساری دنیا اُس کے خلاف سازش کئے ہوئے ہے حتیٰ کہ قانونِ قدرت بھی اُس کی خوشی کو غارت کرنے کے لئے بدل گیا ہے، شاعر نے ایک بڑی پیچیدہ اور نازک بات بڑے دل نشین انداز میں ادا کر دی ہے۔ یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔

ایک دوسرے شعر میں بھی غالب نے شمع کو "دلیل سحر" کے طور پر پیش کیا ہے لیکن چونکہ اس میں شبِ ہجراں کی تصویر کھینچی لہٰذا وہ "خموش ہے"۔ ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

اسدؔ یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

توام :- جُڑواں بھائی۔

یہ شعر غالبؔ کے غیر متداول کلام نسخۂ حمیدیہ میں پایا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے "عجز، بے سامانی اور فرعونیت میں چنداں فرق نہیں ہے" بظاہر یہ دونوں باتیں ایک دوسرے کے بالکل متضاد نظر آتی ہیں لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ قول صداقت سے خالی نہیں۔

انتہائی عجز و بے سامانی میں انسان ہر قسم کی پابندی اور ذمہ داری سے آزاد ہو جاتا ہے اور اس کی ساری کائنات محض اُس کی ذات تک محدود ہو جاتی ہے۔ وہ دنیا اور دنیا والوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ یہی سمجھتا ہے کہ ع ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟ وہ زمانہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے بجائے اس کو مُنہ چڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ہر قسم کی قید اور بندش سے بالاتر سمجھنے لگتا ہے۔ فرعونیت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دو متضاد کیفیتیں اپنے نتیجہ میں ایک نظر آتی ہیں۔ شاعر نے غیر معمولی بصیرت سے کام لے کر ان دونوں کیفیتوں کو توام کہا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اسدؔ یہ تیری عجز و بے سامانی فرعونیت سے کم نہیں ہے۔ جسے تو اپنی بندگی کہتا ہے وہ دراصل خدائی کا دعوےٰ ہے۔ غالبؔ نے ایک دوسرے شعر میں اپنی بندگی کو نمرود کی خدائی سے

تشبیہ دی ہے۔ ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

شعر زیر بحث کا بنیادی خیال یہ ہے کہ خواہ اپنی فرعونیت کے باعث خواہ اپنے عجز و بے سامانی کے باعث کوئی انسان جب عام سماجی اقدار کو پس پشت ڈال دیتا ہے تو وہ سماج کے لئے ایک خطرہ بن جاتا ہے۔

(حاشیہ) اس شعر پر بایں طور غور فرمائیے :۔

"یعنی عجز و بے سامانی اسد، توام عجز و بے سامانی فرعون ہے، اس لئے جس طرح عجز فرعون نے اُسے دعوائے خدائی سے نہ روکا، اُسی طرح عجز اسد نے اُسے بھی دعوائے خدائی سے باز نہ رکھا۔ فرعون کا دعوائے خدائی تو ظاہر ہے کہ وہ پکار اٹھا تھا "انا ربکم الاعلیٰ" اسد کا دعوائے خدائی یہ ہے کہ وہ اپنے بندہ ہونے کا اقرار کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی موجود ہے، بہ الفاظ دیگر جب کوئی شخص کسی کی بندگی کا دعوے کرتا ہے، تو وہ معبود اور عابد دو جداگانہ ہستیاں تسلیم کرتا ہے، اور وحدۃ الوجود کے ماننے والوں کے نزدیک معبود کے علاوہ کسی ہستی کا تسلیم کرنا گویا اُسے خدا قرار دینا ہے، کیونکہ صفت وجود سے متصف صرف ذات باری ہے، دوسرے کو موجود قرار دینا اس کا شریک خدائی قرار دینا ہے اور جب یہ شریک خود اُسی کی ذات ہو، تو اس کا مطلب ہوا دعواے خدائی کرنا۔"

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ؟
ہے مکرر لبِ ساقی میں صلا میرے بعد

حریف :- مقابل۔

صلا :- آواز دینا۔ صدا لگانا۔

مئے مرد افگنِ عشق :- آدمی کو پچھاڑ دینے والی شراب عشق۔

مولانا حالی نے اس شعر کے معنی یوں بیان کئے ہیں :-

"اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ جب سے میں مر گیا ہوں مئے مرد افگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اس لئے اُس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے"۔

"مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا غالب خود بیان کرتے تھے اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کے صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے 'کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ؟' یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا تو اس مصرعہ کو مایوسی کے لہجے میں مکرر پڑھتا ہے 'کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگن عشق !' یعنی کوئی نہیں ہوتا اس میں لہجے اور طرزِ آواز کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے

اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کی جائے گی تو فوراً یہی معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے بعض ذو معنی اشعار کے متعلق لکھا ہے :۔

"ایک خصوصیت ان کے کلام میں ایسی ہے جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں موجود نہیں ہے جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مستتر ہیں، ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں۔"

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذو معنی اشعار کہنے کی خصوصیت صرف غالب کے لئے مخصوص ہے۔ ہر قابل ذکر شاعر کے کلام میں یہ خصوصیت کم و بیش پائی جاتی ہے البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اردو شعرا میں غالب کے کلام میں مقابلتاً ایسے اشعار نہ صرف تعداد میں بلکہ حسن بیان اور حسن معنی میں بھی بہت زیادہ ہیں۔

بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اگر کسی شعر کے ایک سے زیادہ معنی نکلتے ہوں تو یہ شعر کی صفت نہیں بلکہ نقص ہے کیونکہ جہاں کسی شعر سے ایک سے زیادہ مطلب ادا کئے جانے کی کوشش کی جائے گی وہاں اپنی جگہ پر ہر مطلب سست اور مبہم ہو جائے گا۔ اس خیال کی بنیاد صرف ایک احتمال پر ہے لہٰذا اس سے کوئی مسلمہ نہیں قائم کیا جا سکتا۔ ایک ہی شعر سے ایک سے زیادہ ہم پلہ مطالب ادا

ادا کرنا یقیناً مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ اور اگر کسی شاعر کی ہمت دشوار پسند اپنے لیے یہ مشکل آسان کرلے تو وہ یقیناً داد کا مستحق ہے۔

غالب کے شارحین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ بعض اشعار کے مطالب کے متعلق اپنے اپنے ذوق اور سخن فہمی کی بنا پر ان شارحین میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن اس اختلاف کے یہ معنی ہرگز نہ لینا چاہیئے کہ غالب کے اس قسم کے سب اشعار کے ایک سے زیادہ مطالب ہیں۔ درحقیقت اپنی اپنی جگہ پر ان کا بنیادی مطلب ایک ہی ہے جس کو مختلف شارحین نے اپنے اپنے زاویۂ نگاہ اور انداز بیان سے سمجھایا ہے۔

بعض اشعار کے صرف کھینچ تان کر ایک سے زائد مطالب بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ کوشش اُس وقت تک قابل پذیرائی نہیں ہوسکتی جب تک سب مطالب بقریب قریب یکساں لطافت اور بلاغت کے حامل نہ ہوں۔

البتہ غالب کے کچھ اشعار ضرور ایسے ہیں جن سے بلا تکلف ایک سے زائد مطالب نکلتے ہیں اور ہر مطلب اپنی جگہ پر قریب قریب مساوی حیثیت سے مستحکم اور مستحسن نظر آتا ہے۔ ایسے فکر انگیز اور معنی خیز اشعار اُن کی قادر الکلامی کا بیّن ثبوت ہیں۔ متذکرہ بالا شعر انھیں اشعار میں سے ایک ہے اور بہت خوب ہے۔

فیضی نے کہا ہے ؎

گر دفنا شد نہ حریفانِ بزمِ عشق
بر خاک ریز جرعۂ مردآزمائے را

مطلب یہ کہ بزم عشق کے مرد میدان خاک میں مل چکے لہذا اب مرد آزما (مردوں کو زیر کر دینے والی) شراب کا کوئی پینے والا نہیں رہا، لہذا اسے زمین پر لنڈھا دے۔

غالبؔ کا زیر بحث شعر فیضیؔ کے شعر سے زیادہ پُر تاثیر ہے۔ ساقی کا بار بار دعوت دینا اور کسی میں اس کے قبول کرنے کی ہمت کا نہ ہونا ایک عجیب ڈرامائی اور دردناک منظر پیش کرتا ہے اور شاعر کے اس دعوے کا کہ اس کے بعد "مے مرد افگن عشق" کا کوئی حریف نہیں رہا مکمل ثبوت بھی فراہم کر دیتا ہے۔ فیضیؔ صرف ساقی سے فرمائش کرتا ہے کہ "جرعۂ مرد آزما" کو اب زمین پر لنڈھا دے کیونکہ اس کا کوئی پینے والا باقی نہیں رہا فیضیؔ کا شعر اپنی جگہ پر بہت خوب ہے اور تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اب اس موضوع پر اور کیا کہا جا سکتا ہے لیکن غالبؔ کا شعر خوب تر ہے اور اُس نے وہ سب کچھ کہنے کے بعد جو فیضیؔ نے کہا ہے اُس میں ایک لاجواب نئے پہلو کا اضافہ کر دیا ہے۔
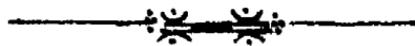
چھوڑوں گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

غالب کے چند اشعار کے متعلق فارسی کے بعض اساتذہ کا مرکزی خیال لینے یا اُن کی عکاسی کرنے کا جو الزام کچھ حضرات کی جانب سے کبھی علے الاعلان اور کبھی در پردہ لگایا جاتا ہے، اس کے سلسلے میں کچھ معروضات اس سے قبل پیش کئے جا چکے ہیں۔ جی تو یہی چاہتا کہ ایسے سب اشعار کے متعلق اس کتاب میں بحث کی جاتی لیکن چونکہ ان میں سے بیشتر پر حضرت نجوؔد موہانی ایسی سیر حاصل روشنی ڈال چکے ہیں کہ کم از کم میرے ایسے کم سواد کے لئے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ اسی کتاب کے بہت سے مقامات نقل کر کے پیش کر دوں لہذا مجبوراً اس خواہش کی تکمیل سے گریز ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ارباب ذوق اُس کتاب کا خود مطالعہ فرما سکتے ہیں۔ حضرت نجوؔد موہانی کے مضمون میں سب سے زیادہ اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ عام طور سے معترضین نے مقابل اشعار کا صحیح مفہوم اور مجموعی تاثر سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اکثر عامتہ الورود مضامین کے متعلق بات ایک ہی ہوتی ہے لیکن کوئی شاعر اس کے کسی ایک پہلو پر اور کوئی شاعر کسی دوسرے پہلو پر زور دیتا ہے اور اس طرح اگر دونوں ہی اپنی اپنی جگہ پہ ایک نیا خیال اور انداز بیان پیش کر دیتے ہیں تو اسے سرقے یا توارد سے تعبیر کرنا بڑی ناانصافی ہے۔ البتہ یہ ایک

بالکل دوسری بحث ہوتی ہے کہ کس شاعر کے خیال اور انداز بیان کو فوقیت حاصل ہے۔

میں نے اس کتاب میں صرف چند ایسے اشعار کو لینے پر اکتفا کی ہے جن میں غالب اور اُن کے پیش رَو شعرا کے خیالات میں بظاہر زیادہ سے زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے مجموعی تاثرات میں بڑا نمایاں فرق موجود ہے۔

زیب عنوان شعر امیر خسرو کے اس شعر سے

خلق می گوید کہ خسرو بُت پرستی می کند
آرے آرے می کنم با خلق و عالم کار نیست

کے متعلق حضرت آرگس کا ارشاد ہے "خیال عام اور معمولی ہیں مگر اتنے قریب ہیں کہ جُدائی مشکل ہے" حضرت بیخود موہانی نے اس کا جواب یوں دیا ہے "جب خیال عام ہیں اور معمولی تو پھر بیان پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی" "چھوڑوں گا میں نہ" اور "چھوٹے نہ خلق گو" ان ٹکڑوں سے غالب کے شعر کا حسن بڑھ گیا ہے"

میری رائے میں ان دونوں اشعار میں ایک اور بھی نازک سا فرق ہے جو دونوں اشعار کے مطالب سامنے رکھنے سے خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

حضرت خسرو کا ارشاد ہے کہ خلق کہتی ہے کہ خسرو بُت پرستی کرتا ہے۔ ہاں ہاں میں کرتا ہوں مجھے خلق اور دنیا سے کوئی مطلب نہیں ہے

مفہوم یہ کہ دنیا والوں کو میرے اس کام پر معترض ہونے کا کوئی حق نہیں ہے۔ یہ معنی بھی نکل سکتے ہیں کہ خلق اور دنیا کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مجھے ان کے اعتراض کی کیا پرواہ؟ حاصل شعر یہ ہے کہ عاشق کی نظر میں دنیا والوں کی رائے کی کوئی وقعت نہیں ہے اور وہ ان کا اپنے سے یا اپنا ان سے کوئی تعلق محسوس ہی نہیں کرتا۔

اس جگہ پر یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں "عالم" کا لفظ محض ضرورت شعری کی بنا پر آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ پہلے مصرعہ میں صرف "خلق" کہا گیا تھا۔ لہٰذا دوسرے مصرعہ میں "خلق و عالم" دونوں کہہ کر زور بیان میں اس طرح اضافہ کر دیا گیا ہے کہ دنیا والے کیا مجھے دنیا کی کسی چیز کی پرواہ نہیں ہے۔ لیکن بہرکیف 'عالم' کا لفظ یہاں پر کھٹکتا ضرور ہے۔

غالب ایک بالکل دوسری بات کہتے ہیں۔ "چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر" کہہ کر وہ دنیا والوں کے اعتراض یا انگشت نمائی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے، نہ وہ ان کے اعتراض یا انگشت نمائی کرنے کے حق کو چیلنج کرتے ہیں بلکہ کہتے یہ ہیں کہ میں جانتا ہوں کہ دنیا مجھ پر لعنت ملامت کرے گی اور درست کرے گی لیکن کروں کیا عشق نے بے بس کر رکھا ہے۔ میں اس بت کافر کی پرستش نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کے لئے میں دنیا کی ذلت اور تحقیر کا ہدف بنتا ہوں تو بنا کروں۔ مجھے احساس ہے کہ میں کتنی بڑی قربانی کر رہا ہوں لیکن دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔

خسترو کو دنیا سے اپنی بیزاری میں یہ احساس ہی نہیں کہ وہ اپنے عشق کی کیا قیمت ادا کر رہا ہے۔ غالب کو اس کا اندازہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ اس کو خوشی سے ادا کر رہا ہے۔ یک کی اضطراری کیفیت ہے، اور دوسرے کی اختیاری صورت۔ خسترو دنیا والوں کے الزام کا صرف جواب دیتے ہیں، لیکن غالب آگے بڑھ کر اُس کو دعوت دیتے ہیں۔

جیسا کہ حضرت بجوؔد موہانی نے اشارہ کیا ہے "چھوڑوں گا میں نہ" اور "چھوٹے نہ خلق گو" بڑے متناسب اور برمحل ٹکڑے ہیں۔ اسی طرح لفظ "کافر" ہر دو مصرعوں میں بڑا پُر لطف مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ جسے شاعر پوجتا ہے وہ بھی کافر ہے اور اُسے پوج کر خود بھی کافر بن رہا ہے۔ شاعر نتیجے سے بے خبر نہیں لیکن اس کے باوجود اپنی بات کا پورا اور دھن کا پکا ہے اور اُس نے جو ٹھان لی ہے اُس کو پورا کر دکھانے میں اُس کے پائے استقلال میں کوئی جنبش نہیں ہے۔ انجام سے بے پرواہ وہ اپنی بات پر اٹل ہے۔

خسترو کا شعر ایک شکستہ دل انسان کی پکار ہے اور غالب کا شعر ایک حوصلہ مند انسان کی للکار ہے۔ شعر دونوں ہی اچھے اور بہت ہی اچھے ہیں، اب یہ اپنی اپنی نظر ہے کہ کون کسے بہتر سمجھے۔

لرزتا ہے مرا دِل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

بقول آغا محمد باقر صاحب عام طور سے شارحین نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں :۔

شبنم کے چمکنے کو لرزنے سے تعبیر کیا ہے۔ میں ایک ایسا قطرۂ شبنم ہوں جو خار بیاباں کی نوک پر آویزاں ہے۔

آفتاب مجھے جذب کر لینے کے لئے کیسی کیسی سرگرمیاں دکھا رہا ہے۔ کہاں میں اور کہاں آفتاب ؟ نوک خار پر ہونے کی وجہ سے میری فنا تو ویسے ہی بہت قریب ہے، اس لئے آفتاب کی تکلیف فرمائی پر میرا دل لرزتا ہے کہ اتنی سی بات کے لئے کس قدر کوشش کر رہا ہے۔

میں اس شعر کا مطلب یوں سمجھتا ہوں :۔

میں ایک قطرۂ شبنم ہوں ایسا حقیر اور بدنصیب کہ میں پھول پر بھی نہیں بلکہ کانٹے کی نوک پر ہوں۔ چمن بھی میرا مقدر نہیں ہے بلکہ بیابان میں ہوں مہر درخشاں (چمکتے ہوئے آفتاب) کی ایک شعاع پڑتے ہی میں اس میں جذب ہو کر فنا ہو جاؤں گا۔ لیکن میرا دل اس خیال سے کانپ رہا ہے کہ میرے ایسے ناچیز اور ہیچ مقدار قطرے کو جذب کرنے کے لئے مہر درخشاں کو مجھ پر اپنی شعاع ڈالنے کی تکلیف گوارا کرنا پڑے گی! مطلب یہ کہ کاش مجھے یہ توفیق ہوتی کہ میں خود بخود آفتاب میں جذب ہو جاتا اور مجھے اپنے اس مقدر

تک پہونچنے کے لئے اس کی شعاع کا احسان نہ اُٹھانا پڑتا۔

شعر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ شاعر اپنی عالی ظرفی اس حیثیت سے کہ انتہائی حقیر ہونے کے باوجود وہ کسی کا احسان نہیں لینا چاہتا، ظاہر کر رہا ہے۔ خود تو کسی دوسرے کو اپنی جان تک حوالے کر دینے کے لئے تیار بیٹھا ہے لیکن دوسرے کو اس سلسلے میں جو زحمت اُٹھانا پڑے گی اس کو اپنے اوپر ایک احسان سمجھ کر اس سے خائف ہے۔ جان دینے میں کوئی بات نہیں لیکن احسان اُٹھانے کے خیال سے دل کانپ رہا ہے۔

شبنم اور آفتاب غالب کا مرغوب طبع مضمون ہے، کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:۔

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

خورِ شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سرتا بہ پاگذارشِ ذوقِ سجود تھا

میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

یارب، وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

شعر کیا ہے کڑی کمان کا تیر۔ سنتے ہی دل میں اُتر کر پتھر کی لکیر بن جاتا ہے۔ مطلب بالکل عام فہم ہے البتہ اس کے چند پہلو بڑے پُر لطف اور غور طلب ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ اگر مجھ کو دوسری زبان نہ دے تو اُن کا دل بدل دے پہلی ترجیح اپنی زبان کے بدلے جانے کی ہے۔ یعنی میری زبان میں ایسی تاثیر دے دے کہ میں اپنے محبوب کے دل پر اپنا سکہ جما دوں۔ اس طرح اپنی کوشش سے اس کو مسخر کر لینے کا لطف ہی دوسرا ہے۔ لیکن اگر یہ ممکن نہیں ہے تو پھر اس کا دل بدل دے یعنی اس میں ایسی اثر پذیری یا مادہ قبولیت پیدا کر دے کہ وہ میری بات مان جائے۔

یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ مجھے تو دوسری زبان ملنے سے رہی لہٰذا اُسی کا دل بدل دے۔

یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ دونوں برابر کی درخواستیں ہیں، یعنی یا میری زبان بدل دے یا اُس کا دل بدل دے۔ یہ کر یا وہ کر۔ بہر صورت میری کچھ تو پذیرائی ہونی ہی چاہیے۔

یہ تشریح بھی ہو سکتی ہے کہ غالب نے یہ شعر اپنے محبوب کے متعلق نہیں بلکہ اپنے اُن معترضین کے متعلق کہا تھا جنھیں اُن کی زبان

مشکل ہونے کی شکایت رہتی۔ شاعر چل کر کہتا ہے یا رب انھوں سنے (معترضین نے) نہ اب تک میری بات سمجھی ہے نہ آیندہ سمجھنے کی توقع ہے ایسی صورت میں اگر میری زبان نہیں بدلتا ہے تو اُن کے دل ہی بدل دے تاکہ ان پر میری بات کا اثر تو ہو۔

غالب کو اپنی بات کی نارسائی کا تو یہ شکوہ ہے لیکن دوسری طرف اپنے محبوب کی بات کی اثر انگیزی کا وہ یہ عالم دکھاتے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب نے اس بات کی اکثر طرح طرح سے شکایت کی کہ ان کی بات لوگ سمجھتے نہیں۔ کبھی اس کو اپنے وارفتگی سے تعبیر کیا ہے اور کبھی دوسروں کی ناقدری سے جس کے متعلق اپنی نفرت آمیز بے تعلقی ظاہر کی ہے ؎

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار — مگر آشفتہ بیانی میری!
گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے — خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے
نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اسد ارباب فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاقِ تحسیں کا
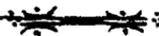
ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

مولانا حالی نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں: - "اس شعر میں سارا زور 'ہم' کے لفظ پر ہے یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے اس وقت تک راہ معرفت الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِ راہ ہے۔ پس اگر ہم نے بُت شکنی میں سُبک دستی حاصل کر لی تو کیا فائدہ۔ یہ بڑا بھاری بُت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔"

بہت سے دیگر شارحین نے مولانا حالی کی تشریح کی تائید کی ہے۔ "بُت شکنی" کے لفظ سے پہلے پہل ذہن اسی طرف متوجہ ہوتا ہے کہ یہ شعر معرفت الٰہی میں کہا گیا ہے۔

بسا اوقات ہم بعض عقائد، توہمات اور تعصبات کے بھی ذہنی بُت بنا کر اُن کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ ان عقائد، توہمات اور تعصبات سے چھٹکارا پانے کو بھی بُت شکنی کہا جا سکتا ہے۔

شعر کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے (جو شعر کے الفاظ یا معنویت کے لحاظ سے کسی طرح کمزور یا مبہم نہیں ہے) کہ اگرچہ ہم بہت سے فرسودہ عقائد کے بتوں کو توڑ کر رسمی تقلید کے انحراف میں کافی مہارت حاصل کر چکے ہیں لیکن ہماری ہستی اپنے بشری تقاضوں سے مجبور ہے اور وہ ہمارے لیے نئے نئے عقائد کے بُت پیدا کرتی رہتی ہے۔ ہم ایک بُت توڑتے ہیں

تو دوسرا بنا بھی لیتے ہیں۔ ہم بُت شکن ہونے کے ساتھ ہی ساتھ بت تراش بھی واقع ہوئے ہیں۔ مفہوم یہ کہ اگر ایک طرف ہم ایک بات کی اندھی تقلید چھوڑ کر اپنی سمجھ داری کا ثبوت دیتے ہیں تو دوسری طرف اپنی فطری نادانی کے باعث کسی دوسری بات کی اندھی تقلید کرنا بھی شروع کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر دیکھئے کہ پہلے اہالیان یورپ نسل اور مذہب کے عقائد کی بنا پر خونریزیاں کیا کرتے پھر انھوں نے ان امتیازات کے بُت توڑ ڈالے لیکن ساتھ ہی ساتھ انھوں نے قومیت کا ایک نیا بُت بھی تراش لیا اور اب محض اس کی بنا پر پہلی اور دوسری جنگ عظیم ہو چکی ہیں۔ ہندوستان میں دیکھئے پہلے مغرب پرستی کو طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا، لیکن اب صدیوں سال پُرانے کلچر کو از سرِ نو اپنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس قسم کے انتہا پسند رجحانات کے پیچھے معقولیت کم اور جذباتیت زیادہ ہوتی ہے جو انسان کی بنیادی کمزوری ہے۔ شاعر غالباً اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دُور دراز

یہ شعر بڑا بلیغ ہے اور اس میں غضب کی اشاریت ہے جس سے ذہن میں طرح طرح کی تصویریں اُبھرنے لگتی ہیں۔

تو اپنی زلفوں کے حلقوں کو سنوار رہا ہے اور میں عجیب عجیب وسوسوں کا شکار ہو رہا ہوں۔ یہ وسوسے کیا ہیں، ان پر بعض شارحین نے یوں طبع آزمائی کی ہے:۔

حسرت موہانی: ————

"تیری آرائش میرے کمال محبت سے بدگمانی کا باعث ہے یعنی تو یہ سمجھتا ہے کہ مجھے گرفتار رکھنے کے لئے ہنوز آرائش ظاہری کی ضرورت باقی ہے، حالانکہ میری محبت اس سے مستغنی ہے۔"

نظم طباطبائی: ————

"دیکھیے اب کون کون عاشق ہوتا ہے، یا کس کس عاشق کو یہ بناؤ دکھایا جاتا ہے۔"

بیخود دہلوی: ————

"دیکھیے کتنے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے۔"

آسی: ————

"یہ آرائش مجھ پر کیا کیا ستم کرے گی؟ یہ آرائش کر کے تو کہاں جائے گا؟"

سلیم چشتی :

"یہ شعر ابہام اور اجمال کی بہت عمدہ مثال ہے اور ارباب ذوق جانتے ہیں کہ یہ چیزیں غزل کی جان ہیں، علاوہ بریں غالب نے تقابل کی صنعت بھی پیدا کی ہے جس سے شعر کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں تو اپنے حسن کی آرائش میں مشغول ہے اور میرے دل میں مختلف قسم کے اندیشے پیدا ہو رہے ہیں مثلاً یہ کہ خدا معلوم تو کس کے لئے یہ بناؤ سنگار کر رہا ہے یا یہ کہ خدا معلوم اب کون کون لوگ تجھ پہ عاشق ہوں گے اور مجھے کیسے کیسے صدمے اٹھانے پڑیں گے۔"

اس شعر کا ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے کہ ایک تو ہے جسے اپنے حسن کو سنوارنے ہی سے فرصت نہیں ملتی، تیری ساری زندگی صرف اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور ایک میں ہوں جسے ہمہ وقت ساری خدائی کا غم کھائے جاتا ہے اور خود اپنا کوئی ہوش ہی باقی نہیں رہا ہے۔ معشوق اور عاشق کی مصروفیتوں کا موازنہ کیا ہے۔ غیر متداول کلام کا ایک شعر ہے :-

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ!
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے!

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

یہ شعر غالب کے متداول دیوان میں شامل نہیں ہے بلکہ نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت سے منظر عام پر آیا ہے۔ اپنی اشاریت اور معنویت کے لحاظ سے عجیب و غریب شعر ہے۔

عبدالباری آسی نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں:۔ "اے بہار پیرائے عالم! بے شک ہم تیرے گنہ گار ہیں اور یقینی تیرے عاصی ہیں کہ تیرے ماسوا ہم کو پھول چننے یا گلشن کے تماشے کی تمنا ہے۔ ہم کو چاہیے تھا کہ تیرے سوا اور کسی کی تمنا نہ رکھتے۔"

پہلا مصرع بہت صاف ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم نے گلشن کا تماشہ کیا اور کچھ پھولوں کے چننے کی تمنا کی، مطلب یہ کہ ہم نے اس دلچسپیوں سے بھرپور دنیا کو دیکھا اور اس کی کچھ دلچسپیوں میں حصّہ لینے کی خواہش کی (چونکہ بقدر حوصلہ حصہ نہیں لے پایا لہذا شاعر اس کو صرف حصّہ لینے کی خواہش سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کو اپنا فعل کم سے کم دکھانا مقصود ہے)

دوسرے مصرع کو پڑھتے وقت صرف لہجے میں تھوڑا سا تغیر پیدا کر دینے سے کئی معنی نکل سکتے ہیں۔

بہار آفرینا:۔ گلشن کی رعایت سے بڑا جامع اور ساتھ ہی ساتھ بہت دلکش لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ جب تو بہاروں کا

خالق ہے تو تیرے لیے صرف گلشن کا تماشا اور پھولوں کے چُننے کی تمنا کیوں موجب ناراضگی بن سکتی ہے! تیرے پاس کمی کیا ہے۔

آسی صاحب کے معنی صحیح تسلیم کیے جائیں تو اس لفظ سے یہ اشارہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب خود بہاروں کا خالق موجود تھا تو پھر صرف گلشن کے تماشے وغیرہ پر توجہ منتشر کیوں کی گئی؟

گنہگار ہیں ہم:- کیا صرف اتنی سی بات پر تو ناراض ہو گیا۔ (تعجب)

بے شک ہم گنہگار ہو گئے۔ (اعتراف)

دیکھ تیرا گنہگار حاضر ہے۔ (طنز)

ہم کو گنہگار کون کہتا ہے۔ ہم سے کون سا ایسا گنہ سرزد ہو گیا (استفہام انکاری)

بس اتنی سی بات پر ہم تیرے گنہگار ہو گئے۔ (تحقیر)

دراصل شاعر اس شعر میں اپنے (یا انسان کے) گناہوں کی بڑی خصوصیت سے صفائی پیش کرتا ہے اور خدا سے ان کے متعلق درگزر کرنے کی استدعا کرتا ہے۔ ہم نے اس دلچسپیوں سے بھرپور دنیا کو دیکھا اور بہ تقاضائے بشریت ہم نے بھی کچھ دلچسپیوں سے محظوظ ہونے کی کوشش کی، تو اے بہار آفرینا اس میں کون سا ایسا غضب ہو گیا۔ کیا بس اتنی سی بات پر ہم گنہگار ہو گئے! کیا تیری پیدا کی ہوئی بہار پر ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ ہم اُسے دیکھ کر دُور سے خوش ہو سکیں؟ یا اُس کے متعلق اپنے دل میں کوئی تمنا کر سکیں۔

(حاشیہ) "اگر اس شعر کو حافظ کے ان دو شعروں کی روشنی میں پڑھا جائے تو کیسا رہے گا:-

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہٴ
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

گنہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش و گو گناہ من است"

(محشی)

سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے، خاتمِ جمشید نہیں

عام طور سے شارحین نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :۔

"جام مے کی سلطنت جمشید سے رندوں کو دست بدست ملی ہے ۔ یہ جام مے خاتم جمشید نہیں ہے کہ صرف جمشید ہی کے ہاتھ کے لیے مخصوص ہو اور دوسرے اس سے محروم رہیں"

سعید صاحب کو اس تشریح کے متعلق جزوی اختلاف ہے۔ لکھتے ہیں :۔

"سلطنت اور جام کو مرادف قرار نہیں دینا چاہیے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سلطنت واسطہ بواسطہ منتقل ہوتی رہتی ہے ۔ جامِ مے خاتم جم یا سلطنت جم نہیں کہ صرف ایک شخص کے لیے مخصوص ہو اور اُسی کی ذات پر ختم ہو جائے"

پروفیسر تسلیم چشتی صاحب نے اس شعر کے معنی یوں بتائے ہیں :۔

"شاعر نے جامِ مے اور خاتم جمشید کا مقابلہ کیا ہے اور جامِ مے کی فضیلت ثابت کی ہے ۔ سلطنت سے جامِ مے یا سلطنتِ مے نوشی مراد ہے ۔ کہتے ہیں کہ جامِ مے مثل سلطنت کے، جو رندوں کو دست بدست (یکے بعد دیگرے) پہونچا ہے ۔ یہ خاتم جمشید تو نہیں ہے جس پر کسی کا نام کندہ تھا اور اس لیے اُسی کے پاس رہتا"

میں اس شعر کا یہ مطلب سمجھتا ہوں کہ جامِ مے خاتم جمشید نہیں ہے جو کسی ایک شخص یا اُس کے ورثا کے لیے مخصوص ہو ۔ یہ ایک سلطنت ہے جو

ہمیشہ اس کے اہل یا اس کے لئے جد و جہد کرنے والے شخص کو نصیب ہوتی ہے۔ یہ وراثت میں نہیں بلکہ ہاتھوں ہاتھ چلتی ہے۔ یہ قناعت اور انتظار سے نہیں بلکہ آگے بڑھ کر جان کی بازی لگا دینے سے حاصل ہوتی ہے۔

جام مے کو سلطنت کہہ کر غالب نے قیامت کی بات پیدا کر دی ہے، اس سے کئی بڑے معنی خیز پہلو نکلتے ہیں۔

ایک مے کش جام مے کو سلطنت سمجھتا ہے۔ جام مے نصیب ہو جاتا ہے، تو وہ جانتا ہے کہ مجھے دنیا بھر کی حکمرانی مل گئی۔ اب جو میرے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں۔

ایک مے کش شراب کے پیالے ہی کو اپنی سلطنت سمجھتا ہے اس کے حصول کے بعد اُسے دنیا کی کسی بات کی ہوس باقی نہیں رہتی۔ یہ اُس کا منتہائے زندگی ہے۔

جام مے کا حصول کسی سلطنت کے حصول سے کم مشکل نہیں۔ اس کو پانے کے لئے بھی جان کی بازی لگا دینی پڑتی ہے۔

جام مے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ یہ ہاتھوں ہاتھ چلتا ہے۔ سلطنت کی طرح یہ صرف ہمت مردانہ اور جرأت رندانہ سے ملتا ہے۔

غالب نے شراب کو سلطنت کہہ کر ایک مے کش کے مخصوص زاویہ نگاہ کی بھی نہایت دلآویز ترجمانی کی ہے، وہ دنیا کے سارے کاروبار کو ہیچ سمجھتا ہے، اس کے لئے یہاں کی سب سے قابل قدر اور با اختیار چیز صرف شراب کا پیالہ ہے۔

جامِ مے اپنے پینے والے کو تخیلات کی سلطنت بخش دیتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ
شراب کے موضوع پر غالب کے کچھ اور اشعار بھی ملاحظہ ہوں،
جو عمر خیام کے لیے بھی قابلِ رشک ہو سکتے ہیں۔ ؎

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہر چند کہ ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار
رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

سعید صاحب اور آسی صاحب نے اس شعر کی بڑی دل چسپ تشریح کی ہے :-

" ہر محبوب بناؤ سنگار اس لئے کرتا ہے کہ لوگ اُسے دیکھیں اور اس پر عاشق ہو جائیں۔ چنانچہ ہمارے محبوب نے بھی خوب بناؤ سنگار کئے اور اپنے اس مطلب میں کامیاب ہوا۔ جب سارا جہان اس پر عاشق ہو گیا تو اس نے آتشِ اشتیاق دید کو مشتعل کرنے کے لئے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ نقاب ڈالنے کا اصل مدعا یہ ہے کہ کوئی شخص اُسے نہ دیکھے جب کوئی اُسے دیکھتا نہیں تو پھر آرائشِ جمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن ہمارے محبوب کو جمال آرائی کا اس قدر شوق ہے کہ باوجود نقاب ڈالنے کے اُسے آرائشِ جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ پردے میں بھی آرائشِ جمال کے لئے ہر وقت آئینہ پیش نظر رکھتا ہے "

اس تشریح میں یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ یہ مفہوم کہاں سے پیدا ہو گیا کہ محبوب نے پہلے چہرہ دکھا کر سارے جہاں کو عاشق کیا اور پھر نقاب ڈال لی اور اب بلا ضرورت نقاب کے اندر آرائشِ جمال کر رہا ہے۔ سیدھی سی بات یہ کیوں نہ کہی جائے کہ ابھی نقاب اٹھا ہی نہیں ہے۔

وہاں نقاب کے اندر آرائشِ جمال کی جارہی ہے اور یہاں مشتاقانِ دید
نقاب اُٹھنے کے انتظار میں مرے جارہے ہیں۔

حضرت طبا طبائی اور حضرت نجم دہلوی نے اس شعر کا مطلب
یوں سمجھایا ہے :۔

"نقاب استعارہ ہے حجاب قدس کا اور آئینہ اس میں "علم ما یکون
وما کان" کا حکم رکھتا ہے، اور آرائش جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے
"کل یوم ھو فی شان" کی۔"

سلیم چشتی صاحب نے اس شعر کا مفہوم یوں بتایا ہے :۔

"بہت بلند پایہ شعر کہا ہے اور انداز بیان بھی بہت دلکش ہے۔ کہتے
ہیں کہ حق تعالےٰ اس کائنات کو پیدا کرکے فارغ نہیں بیٹھ گیا بلکہ وہ
ہر لحظہ فعل تخلیق یا اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف رہتا ہے۔ یہ شعر
تشریح ہے اس آیت کی "کل یوم ھو فی شان" یعنی اللہ تعالےٰ ہر لحظہ
اپنی ذات کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اگرچہ خدا پردے
میں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے علم ازلی کے مطابق ہر لحظہ نئے
نئے مظاہر میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔"

اس شعر کے متعلق ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری یوں رقم طراز ہیں :۔

"مسئلہ ارتقا کے متعلق ایک عجیب بات یہ ہے کہ ڈارون، سپنسر،
والس، ہیگل، وائسمین، منڈل وغیرہ نے تقریبًا ایک ہی وقت میں ایک
دوسرے سے آزاد طور پر اس کا پتہ لگایا کہ ہر عہد کی ایک روح العصر

ہوتی ہے ...... مرزا غالب نے بھی مسئلہ ارتقا کو پہچانا ہے۔ مرزا غالب نے اس بات کو کس نزاکت سے کہا ہے ...... یعنی معشوق عالم جو موجودات کے نقاب میں پنہاں ہے برابر اپنی جمال آرائی میں مصروف ہے اور آئینہ رنقاب ہی میں لئے اپنے غازے کو درست کر رہا ہے۔ جب عالم تکمیل کو پہونچ جائے گا تو نقاب الٹ دے گا۔ عالم کو دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کسی چیز کی کمی ہے۔ شش جہت آراستہ ہو رہے ہیں اور منتظر ہیں۔"

غالب کے اس موضوع پر دو شعر ان کے قلم زدہ اشعار میں ملتے ہیں۔

حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز
ہے کفِ مشاطہ میں آئینۂ گل ہنوز

ہے کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور
غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار

کون کہتا ہے کہ غالب کا اپنے زمانے میں اپنی ناقدری کا شکوہ بیجا تھا۔ کس دل سے انھوں نے اپنے مندرجہ بالا شاہ کار قلم زد کر دیے ہوں گے؟ جس وقت روایتی شاعری کا طوطی بول رہا تھا اس قسم کے اشعار کو مغلق اور مہمل سمجھا جاتا اور ان کے لئے غالب کو داد و تحسین کے بجائے طعن و تشنیع کا سزاوار سمجھا جاتا۔

غالب کا بنیادی خیال یہ تھا کہ ابھی حسن کی آرائش کی تکمیل ہی نہیں ہوئی ہے۔ اس کے بننے اور سنورنے اور خوب سے خوب تر ہو جانے کا

سلسلہ بدستور جاری ہے۔ اور یہ ترقی پذیر جلوہ سامانیاں پردے ہی پردے میں ہو رہی ہیں جن کی مشتاقانِ دید کو خبر بھی نہیں۔

شعر کا مطلب صرف یہ ہے اب اسے چاہے معشوقِ حقیقی کی طرف لے جائیے چاہے معشوقِ مجازی کی جانب اور چاہے اس سے مسئلہ ارتقا اخذ کر لیجئے۔

نقاب کے متعلق غالب نے بعض بڑے پُر لطف اور دل پذیر اشعار کہے ہیں۔ ؎

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

مُنھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے مُنھ پر کھلا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حُسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پہ بکھر گئی

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیدادگر کو میں

عام طور سے شارحین نے اس شعر کے معنی یوں بیان کیے ہیں :۔

(۱) احمق لوگ خواہش کو پرستش قرار دیتے ہیں۔ بھلا خواہش اور پرستش ایک چیز کیسے ہو سکتی ہے۔ اس غلط فہمی کی بنا پر اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اُس بتِ بیدادگر کی پرستش کرتا ہوں حالانکہ امر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے، مجھے تو محض اس کی خواہش اور آرزو ہے، میں اس کا پجاری نہیں ہوں۔

(۲) جب پرستش کی جائے گی تو وہ خواہشِ دل ہی سے ہوگی، خواہ اس میں کیسی قدر استغراق کیوں نہ ہو، اور جس امر میں خواہشِ دل شامل ہو وہ عبادت نہیں ہو سکتی، تو ثابت ہوا کہ عبادتِ حق کوئی بجا نہیں لا سکتا صرف دنیا یا بندانِ خواہش کو عابد کا خطاب دیتی ہے۔

(۳) بیخود دہلوی اور طباطبائی کا فرمانا ہے کہ معنی باریک اس شعر میں یہ ہیں کہ شاعر حیران ہو کر پوچھتا ہے، کہ کیا میں اُسے پوجتا ہوں؟ اُسے خبر نہیں کہ معشوق کے سامنے جا کر اظہار نیاز پرستش کی حد تک پہونچ جاتا ہے۔

(۴) اثر لکھنوی کا اس شعر کے متعلق ارشاد ہے کہ شاعر کہتا ہے جسے احمق (ظاہر پرست) پرستش سمجھتے ہیں، وہ در اصل میری خواہش پرستش ہے۔ پرستش کا مفہوم میرے ذہن میں اور ہی کچھ ہے۔ ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی مگر اس کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ خواہشِ پرستش پر لوگوں کو

پرستش کا دعویٰ کا ہونے لگا۔

آثرؔ لکھنوی نے خواہش کے معنی صرف خواہش پرستش بتا کر شعر کو بہت محدود اور بے لطف کر دیا ہے۔ کسی چیز کی بھی خواہش اس کے متعلق عمل سے لازماً کم تر درجے کی ہوتی ہے، پھر شاعر نے اس شعر میں کون سی نئی بات کہہ دی ہے۔

اس شعر کے ایک معنی اور سمجھ میں آتے ہیں :-

شاعر کہتا ہے کہ احمق (حقیقت سے بے بہرہ) لوگوں نے اپنے فریضۂ عبودیت کو اپنے اغراض کا پابند کر لیا ہے۔ ان کی عبادت بے لوث نہیں بلکہ صرف مطلب برآری کا ایک ذریعہ بن کر رہ گئی ہے۔

پہلے مصرعے میں وہ یہ دعوے کرتا ہے اور دوسرے میں خود اپنی مثال سے اس کا ثبوت بہم پہونچاتا ہے۔

خود مجھے دیکھو! میں جو اپنے معشوق کے اس قدر اظہار نیازمندی کیا کرتا ہوں تو کیا میں اس "بت" کو جو "بیدادگر" بھی ہے پوجتا ہوں؟ ہرگز نہیں۔ اس کے سامنے میرا اظہار نیازمندی صرف اپنے اغراض کا تابع ہے۔ مطلب یہ کہ جو معاملہ میرے اور میرے معشوق کے درمیان ہے وہی کسی خواہش کے ماتحت عبادت کرنے والوں اور خدا کے درمیان ہے۔ اس کو حقیقی پرستش یا عبادت قرار دینا حماقت ہے۔

غالبؔ نے اسی مضمون کو بار بار اور طرح طرح سے کہا ہے :- ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

کیا زہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

عام طور سے شارحین نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :۔

"مرزا کا یہ شعر بیت الغزل اور نشتر کہلاتا ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جس کے ساتھ تو ہم خواب ہوا اور جوش اختلاط میں جس کے شانوں پر تیری زلفیں پریشان ہو گئیں اُس کے دماغ کے کیا کہنے ہیں۔ نیند اُس کی قابل رشک ہے۔ راتیں اُس کی خوش قسمت شخص کی صحیح معنوں میں راتیں کہلانے کی مستحق ہیں اور جسے یہ حاصل نہیں نہ اُس کا دماغ ہے نہ نیند ہے نہ راتیں ہیں۔"

اثر صاحب لکھنوی نے اس شعر کی تشریح یوں کی ہے :۔

"شعر میں نیند اُس کی ہے، کا ٹکڑا بہت بلیغ اور اہم ہے اس نے وصل کو خواہشات جسمانی کی آسودگی سے مرتفع کر کے روحانیت میں مبدل کر دیا ورنہ وصل کا جو عام مفہوم ہے اس میں نیند کہاں؟ بقول ے ع

یار کو میں نے مجھے یار نے سونے نہ دیا

نیند اُس کی ہے، اس ٹکڑے سے واضح ہوا کہ قرب معشوق نے بے قراری و اضطراب کا خاتمہ کر دیا۔ یہ حالت اُسی وقت تک تھی جب تک مطلوب شے دسترس سے باہر تھی۔ جب معشوق مل گیا تو سکون کامل میسر ہوا۔ اب نیند اُس کی نیند ہے۔ دماغ اس کا دماغ ہے۔ راتیں اُس کی راتیں ہیں۔ خواب

میں بھی اور عالم بیداری میں بھی۔ شعر کی غیر متحرک اور خاموش مصوری نے معشوق کی زلفیں اس کے شانے پر بکھری ہوئی ہیں اور یہ محو خواب نوشیں ہے دو جسموں کا نہیں بلکہ دو روحوں کے مکمل باہمی جذب کا پیکر بنا دیا۔ عشق میں وصل کا یہی صحیح معیار ہے جس کو بوالہوسوں نے کیا سے کیا بنا دیا ہے۔"

غیر متحرک اور خاموش مصوری کے ذکر پر غالب کے غیر متداول کلام کا ایک شعر یاد آ گیا ؎

گل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

شعر زیر بحث میں آثر صاحب نے نیند اُس کی ہے، سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن اسی کے ساتھ 'راتیں اُس کی ہیں' کا ٹکڑا بھی بڑا معنی خیز ہے، اس میں کچھ بھی نہیں کہا ہے اور بہت کچھ کہہ دیا ہے۔ اب اپنا اپنا ذوق ہے کہ جو کچھ بھی سمجھ لیجیے، سکون کامل یا حسن و شباب کا ارمان انگیز اتصال۔

غالب کا کلام شاہد ہے کہ غالب افلاطونی عشق کے قائل نہیں تھے بلکہ اُن کا عشق عام بشری تقاضوں سے بھرپور تھا۔ غیر متداول کلام کے دو بے پناہ اشعار ملاحظہ ہوں:۔ ؎

اسدؔ جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پرسیدنی جانے!

اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

متداول کلام میں بھی ان کے روحانی نہیں بلکہ جسمانی عشق کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں، مثلاً :۔

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس
زلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

وغیرہ وغیرہ

فارسی کلام میں تو اس قسم کے اشعار کی اور بہتات ہے۔
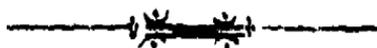
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

خود غالب نے اس شعر کا مطلب، قاضی عبدالجلیل صاحب جنوں بریلوی کو یہ لکھ کر بھیجا تھا:۔

"یعنی تیرا ملنا اگر آسان نہیں تو یہ امر مجھ پر آسان ہے۔ خیر تیرا ملنا آسان نہیں نہ سہی، نہ ہم مل سکیں گے نہ کوئی اور مل سکے گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ تیرا ملنا دشوار بھی نہیں، یعنی جس سے تو چاہتا ہے مل بھی سکتا ہے۔ ہجر کو تو ہم نے سہل کر لیا تھا لیکن رشک کو اپنے اوپر آسان نہیں کر سکتے۔"

مولانا حالی نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے "ایک واقعہ کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے۔ اس مضمون کو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہے مجاز پر محمول کرو دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ ہوتی اس لیے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھ رہتے اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جسطرح آسان نہیں اسیطرح دشوار بھی نہیں اور اسلئے شوق و آرزو کی خلش سے کسیطرح

مولانا حسرت موہانی نے اس شعر کا مطلب یہ لکھا ہے "تحصیل امر دشوار اگرچہ آسان نہیں ہوتی مگر ممکن ضرور ہے اور تحصیل امر محال سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ تیرا ملنا اگر آسان نہ ہو یعنی

دشوار ہو، تاہم سہل (آسان) ہے مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں یعنی محال ہے۔ جس پر میر کسی طرح قابو نہیں ۔"

مولانا حسرت موہانی نے اس شعر کے دوسرے معنی بھی لکھے ہیں اور وہ قریب قریب وہی ہیں جو خود غالب نے لکھے ہیں۔

اس شعر کے بہتر معنی تو وہی ہیں جو غالب نے لکھے ہیں، لیکن مولانا حسرت موہانی کے اول الذکر معنی بھی لطف سے خالی نہیں۔ شاعر نے اس میں ایسے ہم معنی اور متضاد الفاظ 'نہیں آسان'، 'سہل'، 'دشوار'، 'دشوار بھی نہیں'، جمع کر دیے ہیں کہ شعر میں یقیناً ایک سے زیادہ مطالب کا امکان پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا حسرت موہانی نے 'دشوار بھی نہیں' کے معنی 'محال' لیے ہیں جو ہرگز غلط نہیں کہے جا سکتے ہیں۔ *

(حاشیہ)

*مولانا حسرت موہانی کے معنی ایں بہت بعید از فہم ہے۔"

عرشی

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

شعر زیر بحث اور اس غزل کے کئی اشعار بیاض ملائی سے منظر عام پر آرہے ہیں۔

بظاہر اس شعر کے معنی بہت صاف ہیں۔ ایک عام خیال ہے کہ سگ گزیدہ انسان پانی دیکھ کر ڈرتا ہے کیونکہ اس پہ یہ وہم طاری ہو جاتا ہے کہ وہ پانی میں اس کتے کی صورت دیکھے گا جس نے اسے کاٹا تھا۔ شاعر اسی خیال اور وہم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جس طرح کوئی سگ گزیدہ پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح میں آئینے سے خائف ہوں کیونکہ مجھے انسانوں سے سخت تکلیف پہونچی ہے، میں آئینے میں جب اپنی صورت دیکھوں گا تو میری اپنے ہم جنسوں کے متعلق تلخ ترین یادیں تازہ ہو جائیں گی کیونکہ بالآخر میں بھی تو انھیں میں سے ایک ہوں۔

لیکن جس طرح غالبؔ نے اپنے بعض لاجواب اشعار میں شوق، ملکیتی لذت تقریر، ہجوم ناامیدی، جوہر اندیشہ، جذبۂ رقابت، وفور محبت وغیرہ کی انتہائی حدود تک پہونچ جانے کی بہت کامیاب کوشش کی ہے۔ اسی طرح اس شعر میں انھوں نے شدت نفرت کو اس انتہا تک پہونچا دیا ہے کہ تخیل انگشت بدنداں رہ جاتا ہے کہ اب اس موضوع پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ بیخودؔ موہانی نے غالبؔ کی اس

خصوصیت کے متعلق والہانہ جوشِ عقیدت سے کہا ہے "مرزا (غالب) اکثر جس مضمون پر قلم اٹھاتے ہیں اُسے انتہا کو پہونچا دیتے ہیں۔ ہر پہلو پر نظر رہتی ہے اور کچھ اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ اس کا جواب لکھتے وقت نظر کردگان قدرتِ ایجاد سپر انداختہ نظر آتے ہیں۔ ہاتھ سے قلم چھوٹ پڑتا ہے۔ اجزائے شعور بکھرنے لگتے ہیں ۱؎"

کسی بھی انسان کا دوسرے انسان سے نفرت کرنے کا بنیادی محرک کون ہوتا ہے؟ اس کی اپنی ذات! جس سے وہ قدرتاً سب سے زیادہ محبت کرتا ہے، اور جو شخص بھی اس کی راہ میں حائل ہوتا ہے اُس سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اُسے انسانوں کے ہاتھوں ایسی ناقابل برداشت تکلیفیں اور اذیتیں پہونچی ہیں اور اب اُسے ان سے اتنی بے پناہ نفرت ہو گئی ہے کہ دوسروں کی کیا وہ محض اس وجہ سے خود اپنی صورت تک دیکھنے کا روادار نہیں کہ بالآخر وہ بھی انسانی برادری ہی کا ایک فرد ہے۔ انسان کسی دوسرے سے نفرت کرتا ہے اپنی ذات کی وجہ سے۔ لہذا جب وہ دوسروں سے ایسی نفرت کرنے لگے کہ خود اپنی ذات سے بھی محض اس وجہ سے متنفر ہو جائے کہ وہ بھی انھیں کا ہم جنس ہے تو یقیناً یہ شدت نفرت کی آخری حد ہے۔
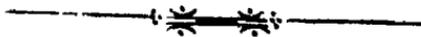
دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا ! !
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں !

یہ شعر غالب کے غیر متداول کلام میں ہے لہذا متداول دیوانِ غالب کے شارحین نے اس کی تشریح نہیں لکھی ہے۔

عبدالباری آسی صاحب نے اس کی شرح یوں فرمائی ہے:۔

"یہ دیر و حرم دونوں تکرارِ تمنا کے آئینے ہیں یعنی ان سے حال کھلتا ہے کہ شوق کو پھر تازہ کیا جائے اور پھر تمنا کا اعادہ کیا جائے گویا کہ شوق کی واماندگی کی پناہیں تراش رہی ہے، یعنی شوق جب تھک جاتا ہے تو ان میں سے ایک میں واماندہ ہو کر پڑ رہتا ہے اور اسی کو اپنی پناہ بنا لیتا ہے جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ پھر کسی تمنا کا آغاز کیا جائے۔"

میں اس شرح سے کچھ نہیں سمجھا۔ میں خود اس شعر کا مطلب یہ سمجھتا ہوں:۔

دیر و حرم:۔ بُت خانہ اور کعبہ۔

آئینۂ تکرارِ تمنا:۔ ایک ہی تمنا کی تکرار کا آئینہ ہیں یعنی ایک ہی خواہش ظاہر کرتے ہیں۔

پناہیں:۔ جائے عافیت۔ فصیلیں۔ حدیں۔ منتہائے مقصد۔

کعبہ اور بُت خانہ ایک ہی تمنا یعنی تلاشِ حق کے دو مظہر ہیں۔ انسان اپنے شوق کی کوتاہی کے باعث انھیں کو اپنا منتہائے مقصد یا جائے عافیت تسلیم کر بیٹھا ہے۔ شاعر اس کمزوری کو قابلِ مذمت سمجھتا ہے۔

انسان کے شوق یا تجسّس کی کوئی منزل نہیں ہونا چاہیئے یا کم سے کم دیر و حرم سے کہیں آگے ہونا چاہیئے۔ لیکن چونکہ انسان میں طلب صادق کی کمی ہے لہٰذا اس نے دیر و حرم کے مفروضات قائم کرکے انھیں کو اپنا حاصلِ زندگی سمجھ لیا ہے۔

اپنی ہستی اور کائنات کے اسرار و رموز کے معلوم کر لینے یا معرفت الٰہی حاصل کر لینے کے لئے انسان کی جستجو بے کراں و بے پناہ ہونا چاہیئے تھی، لیکن اس کے شوق کی کوتاہی نے اس کو اپنے ہی قائم کئے ہوئے چند مفروضات تک محدود کر دیا ہے اور اب مُلّا کی دوڑ مسجد تک کے مصداق وہ انھیں کو اپنے فکر و عمل کی آخری حدیں مان بیٹھا ہے۔ یہ پناہیں یا حدیں جو انسان نے زبردستی اپنے اوپر مُسلّط اور مُتعیّن کر لی ہیں اس کی کم ہمتی کا ثبوت ہیں۔ وہ اب ان سے آگے جاتے ہوئے ڈرتا ہے حالانکہ شوقِ کامل کا تقاضا یہی ہے کہ وہ ان کو توڑ کر آگے بڑھے اور اپنی تلاشِ حق کی کوششوں کو لامحدود کر دے، لاجواب شعر ہے، جس میں فکر و نظر کی آزادی پر زور دیا گیا ہے معنی کی کثرت اور الفاظ کی قلت پر غور کیجیئے تو دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ ایک دوسرے شعر میں کہا ہے :- ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود   قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

غالبؔ تعینات کے قائل نہ تھے ؎

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے   عرش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

مولانا حالی نے اس شعر کا مطلب یہ بیان کیا ہے :۔

"اس شعر میں ازراہ تہذیب اُس کام کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد، مدرسہ اور خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا جب وہی چھوٹ گیا تو اب مسجد میں مل جائے تو، اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو، سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے، یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے"

اس شعر میں غضب کا تیکھا پن اور ظرافت ہے۔ میکدے کے نشاط انگیز ماحول میں ساقی کے ہاتھوں اور دوسرے ہم مشربوں کے ساتھ پینے اور پی کر بہک جانے کا لطف ہی کچھ اور تھا، مگر جب میکدے کے دروازے ہم پر بند ہو گئے اور ہم سے ہماری جنت چھن گئی تو پھر اب ہم جہاں بھی جی چاہے گا اپنا غم غلط کرنے کے لئے پی لیں گے۔ ایک طرف تو یہ مظلومیت اور معصومیت اور دوسری طرف یہ شوخی اور ستم ظریفی کہ اب پینے کا ارادہ کہاں ہے ع

مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

اس شعر میں میکدہ چھڑانے والوں پر ایک چوٹ بھی ہے۔ ان کو سُنا کر

شاعر کہتا ہے میکدہ تو چھوڑ دیا لیکن میکشی کی عادت کب چھوٹتی ہے۔ پہلے ہمارا گناہ میکدے کی چہار دیواری میں محدود تھا اب وہ مسجد، مدرسہ اور خانقاہ جیسے مقدس مقامات تک بھی پہونچ سکتا ہے۔ ضمناً اشارہ یہ ہے کہ ہم کو میکدے ہی میں شراب پینے کے لئے چھوڑ دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ اب وہاں سے نکالا ہے تو دیکھو ہماری شراب نوشی کیا رنگ لاتی ہے۔ اور ہم کیسی کیسی جگہوں کو ناپاک کرتے ہیں۔

شعر سے ایک دوسرا طنزیہ پہلو بھی نکلتا ہے۔ جب میکدہ جو پینے کے لئے سب سے زیادہ موزوں جگہ ہو سکتی تھی، چھٹ گیا تو اب کیا ہے کہیں بھی پی لیں گے۔ پھر اب اس فکر میں کہ کہاں پینا چاہیے شاعر بآواز بلند سوچتا یا اپنے آپ سے کہتا ہے " اچھا تو اب پینے کے لئے مسجد، مدرسہ یا کوئی خانقاہ زیادہ مناسب رہے گی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ایسے پاکیزہ مقامات پر جا کر شراب پئیں گے تو وہاں کوئی ہم پر ایسی مذموم حرکت کرنے کا مشکل ہی سے شبہہ کر سکے گا۔ واعظوں کے لئے ع چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند۔ مسلمات شاعری میں سے ہے۔
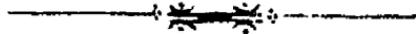
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا!
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

عام طور سے شارحین نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے :۔
کیسی وفا اور کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا تو اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں ہونا کیا ضرور ہے۔ جہاں جی چاہے گا سر پھوڑ لیں گے۔
اسی مطلب کو پیش نظر رکھ کر طباطبائی کا ارشاد ہے :۔
"یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر شاہوار ہے"
آسی فرماتے ہیں :۔
"اس شعر کی بندش میں وہ چستی ہے جس کی تعریف غیر ممکن ہے"
پروفیسر سلیم چشتی کا خیال ہے :۔
"سچ تو یہ ہے کہ بندش کی چستی، الفاظ کے انتخاب، دوسرے مصرع کے تیور، زبان کی خوبی اور مضمون کی دل کشی کی بدولت یہ شعر سحر حلال کے مرتبہ کو پہونچ گیا ہے۔ بہ الفاظ دیگر یہ شعر غالب کے نشتروں میں سے ہے۔ شارحین کے علاوہ غالب کے تمام شائقین بھی اس شعر کی معنویت کے معترف ہیں"
اس شعر کے طرز ادا میں غضب کی بے ساختگی اور تیکھا پن ہے اور اس لحاظ سے اس شعر کی جو کچھ بھی تعریف کی جائے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔ اوپر بیان کئے ہوئے مطلب میں جس بات نے شارحین کو

سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ شاعر کی شان خودداری اور بے نیازی ہے اپنی عزت نفس کی خاطر وہ اپنی وفا، عشق اور معشوق سے بھی دستبردار ہونے کو تیار ہے، لیکن اس مطلب کی روشنی میں شعر کے اس ٹکڑے " جب سر پھوڑنا ٹھہرا " کی حسب دلخواہ وضاحت نہیں ہوتی۔ کیا سر پھوڑنا شاعر کی صرف جبلی عادت ہے؟ اور کسی سے عشق کی اضطراری کیفیت نہیں؟ اس سے تو شعر کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعر (عاشق) جھنجھلا کر اب وفا اور عشق دونوں سے حد درجہ بیزار اور متنفر ہو چکا ہے، لیکن چونکہ اپنے سر پھوڑنے کی جبلی عادت سے مجبور ہے لہٰذا معشوق کو طعنہ دیتا ہے کہ ہمیں سر پھوڑنے کے لئے پتھروں کی کیا کمی ہے۔ تیرا سنگ آستاں نہ سہی کوئی اور سہی۔ ہمیں تو بس سر پھوڑنے سے مطلب ہے۔

میرے خیال میں اس شعر کا ایک دوسرا مطلب بھی ہو سکتا ہے جو پہلے مطلب سے کہیں زیادہ بلیغ، پُرلطف اور شعر کے الفاظ پر حاوی ہے، اور وہ طرز ادا کے بانکپن اور اشاریت میں اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے۔

معشوق، عاشق کو طعنہ دیتا ہے کہ تم میں نہ کوئی وفا ہے اور نہ مجھ سے عشق کرنے کی کوئی صلاحیت۔ تم تو محض ایک دیوانے ہو جو اپنے عالم دیوانگی میں میرے سنگِ آستاں سے اپنا سر پھوڑتے رہتے ہو۔ عاشق صادق اس شعر میں معشوق کی اس جبلی کمی کا بہت دل برداشتہ ہو کر بڑا طنزیہ جواب دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے عشق کا ایک انتہائی مدلل ثبوت پیش کر کے اس کو لاجواب کر دیتا ہے۔

معشوق ہی کے ادا کیے ہوئے الفاظ "وفا کیسی ؟" "کہاں کا عشق ؟"
دُہرا کر عاشق یہ مفہوم ادا کرتا ہے۔ اچھا تو ابھی تک تجھ کو ہماری وفا اور
عشق کا بھی اعتبار نہیں آیا ؟ اور ہم تیری نظر میں صرف عالم دیوانگی میں
تیرے سنگ آستاں سے اپنا سر پھوڑتے رہتے ہیں۔ مگر اے سنگ دل
پھر اس کا جواب تیرے پاس کیا ہے کہ ہم دنیا کے تمام حسینوں کو نظر انداز
کر کے صرف تیرے ہی سنگ آستاں پر اپنا سر کیوں پھوڑتے رہتے ہیں ؟
تجھ سے ہمیں عشق نہ ہوتا اور ہم صرف عالم دیوانگی میں اپنا سر پھوڑتے پھرتے
تو کسی بھی جگہ اُسے پھوڑ سکتے تھے۔ اس کے لیے صرف تیرا ہی سنگ آستاں
کیوں مخصوص ہوتا۔

ہمارا اتنی بڑی دنیا کو چھوڑ کر صرف تیرے ہی سنگ آستاں پر سر
پھوڑنا تجھ سے ہمارے عشق کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے۔ پھر ہماری وفا
اور عشق کے متعلق تیرا اظہار بے اعتباری تیری نادانی نہیں تو اور کیا ہے ؟

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ شعر خیال، زبان اور بیان پر قدرت کا ایک نادر شہ پارہ ہے اگر غور کیجئے کہ شاعر نے کیا بات کن الفاظ میں اور کس انداز سے کہی ہے تو اُس کی جادو بیانی پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ یہ شعر نفسیات کے ایک باریک نکتہ کا حامل اور انتہائی پُر تاثیر اور دردناک ہے۔ یہ ایک قفس بند کے لئے صرف ہمدردی نہیں بلکہ اس کی ذہنی کیفیت اور بدقسمتی کی عکاسی کر کے ایک عبرت انگیز فضا بھی پیدا کر دیتا ہے۔

حضرت طباطبائی لکھتے ہیں "اس قدر معانی ان دو مصرعوں میں سما گئے ہیں کہ ان کی تفصیل یہاں لطف سے خالی نہیں۔ ایک طائر چمن نشیمن سے جدا ہو کر اسیر ہو گیا، اس مضمون پر صرف ایک لفظ 'قفس' اشارہ کر رہا ہے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور قفس میں متردد ہے کہ نہ جانے میرا آشیانہ بچا، یا جل گیا۔ ان تمام معانی پر لفظ 'کل' کا لفظ دلالت کر رہا ہے۔ ایک اور طائر جو اس کا ہم صفیر اور ہمدم ہے وہ سامنے کسی درخت پر آ بیٹھا ہے اور اسیر قفس نے اُس سے رودادِ چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے مگر اس سبب سے کہ اُسی کا نشیمن جل گیا ہے، طائر ہمصفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس و پیش کرتا ہے کہ اس اسیری میں نشیمن کے جلنے کی خبر کیا سُناؤں۔ اس تمام مضمون پر فقط یہ جملہ

دلالت کرتا ہے کہ مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ؂

" علاوہ اس کثرتِ معانی کے اس مضمون نے جو دوسرے مصرعے میں ہے واقعہ کو کیسا دردناک کر دیا ہے یعنی جس گرفتارِ قفس پر ایسی تازہ آفت اور بلائے آسمانی نازل ہوئی ہے اُس نے کیسا اپنے دل کو سمجھا کر مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں کیا میرے ہی نشیمن پر بجلی گری ہو گی یہ حالت ایسی ہے کہ دیکھنے والوں کا اور سُننے والوں کا دل کڑھتا ہے اور ترس آتا ہے اور یہ ترس آجانا وہی اثر ہے جو شعر نے پیدا کیا ہے "

مجھے جناب طباطبائی کے بیان کردہ مطالب کے سلسلے میں صرف ایک بات یہ عرض کرنا ہے کہ شعر زیرِ بحث میں ایک بڑا معرکہ آرا ٹکڑا " نہ ڈر ہمدم " بھی ہے ۔ اس سے جہاں ایک طرف یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہمدم بات کہتے ڈر رہا ہے ، وہاں دوسری طرف اُس کی اس اضطراری کیفیت سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کل چمن میں جو بجلی گری تھی وہ طائرِ قفس بند ہی کے آشیانے پر گری تھی اور اس سلسلے میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ، ورنہ شعر مبہم اور بے اثر ہو جاتا ۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ اپنے بدترین اندیشوں کے باوجود طائرِ قفس بند اپنے ساتھی کو پوری بات بتانے کے لیے اُکسا رہا ہے ۔ غالباً اُمید کی کوئی مدھم سی جوت اُس کے دل کو گرما رہی ہے ۔

شاعر نے طائرِ اسیر کی نا اُمیدی اور مایوسی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے نا اُمید اور مایوس انسان ہمیشہ اپنے متعلق بُری سے بُری ہی بات سوچتا ہے

یہاں بھی طائرِ اسیر کے دل میں چور ہے کہ کل جو بجلی گری ہے وہ یقیناً میرے ہی نشیمن پر گری ہوگی لیکن پھر وہ تھوڑی ہی دیر کے لیے اپنے آپ کو تسلی دینے کے لئے کہتا ہے کہ یہ کیا ضرور ہے کہ وہ چمن کے اتنے بہت سے نشیمن چھوڑ کر میرے ہی نشیمن پر گری ہو۔ لیکن افسوس کہ یہ تسلی بھی دیرپا نہیں ہوسکتی کیونکہ ہمدم اس سے روداد چمن کہتے ڈر رہا ہے۔ اور یہ ڈر صاف اشارہ کر رہا ہے کہ اس کے بدترین اندیشے حقیقت بن چکے ہیں۔

شعر کے تیور بتا رہے ہیں کہ یہ جملہ "گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو" طائرِ اسیر کے منھ سے عالمِ یاس و ہراس میں صرف ہمدم کو سنانے کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو وقتی تسلی دینے کے لئے بے ساختہ نکل گیا تھا۔

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

مختلف شارحین نے اس شعر کے جو مختلف مطالب بیان کئے ہیں اُن کی بنیاد "ہے سخن آزردہ لبوں سے" اور دوسرے مصرع میں لفظ "ایسے" کے مفہوم پر ہے۔ میں انھیں مختصراً درج کرتا ہوں :۔

ہے ..... سخن آزردہ لبوں سے ... قوتِ گویائی نے لبوں کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔
بات کرنے کا جی نہیں چاہتا۔
بات کرنے کو لب ترستے ہیں۔
سخن لبوں سے روٹھ گیا ہے۔

ایسے :ـــــــ اس قدر۔ اتنا زیادہ (مطلب یہ کہ تنگ آنے کی حد بتانا منظور ہے)
اس قسم کے۔ اس طرح کے (مطلب یہ کہ خوشامد طلبوں کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ لبوں کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے)

آثر لکھنوی نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے :۔

"لفظ بت کے دو معنی ہیں۔ ایک تو معشوق اور دوسرے خاموش۔ غالب نے ان دونوں معنوں کو ذہن میں رکھ کر مضمون پیدا کیا ہے۔ چونکہ بت خاموش رہتے ہیں اور اسی میں اپنا وقار سمجھتے ہیں، لہذا ان کی خوشامد کا بہترین طریقہ یہی ہے اور ان کی خوشنودی اسی میں مقصود ہے کہ ان کے

سامنے خاموش بیٹھے رہئے اور بقول ےُ خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تو' پر کاربند ہو جیئے۔ ادھر عشق ہم کلام ہونے، چاپلوسی کرنے اور عرض و نیاز و شرح آرزو کا متمنی، شوق تقاضائے گفتار کرتا ہے، مگر بتوں کی مرضی کہ لب آشنائے تکلم نہ ہو، منہ میں گھنگنیاں بھرے بیٹھے رہو، کیا شوخی ہے، سادگی میں کس قدر پرکاری و ستم ظریفی ہے۔ غالب اُکتا کر چیخ اُٹھتے ہیں کہ ہائے ایسے خوشامد طلب معشوق جو خاموشی کے سوا اور کوئی طریق خوشامد پسند نہ کریں اور اس طرح عاشق کو تڑپائیں اور ترسائیں۔"

باقر صاحب نے 'بیان غالب' میں اس شعر کی تشریح یوں کی ہے:۔

"خوشامد طلب معشوقوں سے ہم ایسے تنگ آئے ہیں کہ سخن لبوں سے آزردہ ہو گیا ہے۔ گویا ان کی محفل میں اب بات چیت کرنے کو بھی ہمارا جی نہیں چاہتا ہے کہ میں اس کی خوشامد کروں تو وہ لب تک آئے۔ گویا رعب حسن سے معشوق کے سامنے بات بھی منہ سے نہیں نکلتی۔"

پروفیسر سلیم چشتی نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے "چونکہ دنیا میں خوشامد پسندوں کی کثرت ہے، اس لئے ہم ان لوگوں سے اس درجہ تنگ آ چکے ہیں کہ حسینوں کی محفل میں بھی (حالانکہ وہ محفل تحسین ہے) کچھ کہنے یعنی حسین کی خوشامد کرنے کو یعنی اُن کے حسن و جمال کی تعریف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

نیاز فتحپوری نے اس شعر کو یوں سمجھانے کی کوشش کی ہے:۔

" اس شعر کے سمجھنے میں عام طور پر یہ غلطی کی جاتی ہے کہ لبوں سے

سخن کی آزردگی کو خود غالب سے متعلق سمجھا جاتا ہے اور اس طرح مختلف تاویلیں کی جاتی ہیں حالانکہ اس کا تعلق بتوں سے ہے اور مفہوم یہ ہے کہ بزمِ بتاں کا یہ حال ہے کہ وہ کوئی بات ہی نہیں کرتے اور چاہتے یہ ہیں کہ ان کی خوشامد کی جائے تو وہ کچھ بولیں۔ اس لئے ہم ایسے خوشامد طلبوں سے سخت تنگ آ گئے ہیں۔"

شعر کا بہت صاف مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ ہم خوشامد طلب معشوقوں سے ایسا تنگ آ چکے ہیں کہ ان کی محفل میں ہمارا بات کرنے کو جی نہیں چاہتا یا ان کی محفل میں ہم بات کرتے بھی ہیں تو آزردگی اور بیزاری کے ساتھ۔ یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے چونکہ ہم بتوں کی خاطر خواہ خوشامد نہیں کر پاتے لہذا اپنی محفل میں وہ ہم سے بڑی آزردگی اور بیزاری کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں چنانچہ ہم ایسے خوشامد پسندوں سے اب تنگ آ چکے ہیں۔"

حاشیہ ۱۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ:-

"بزمِ بتاں میں ہم اس لئے جاتے ہیں کہ حالِ دل سنا کر انھیں اپنے اوپر مہربان کریں گے۔ وہاں پہونچ کر بات ہونٹوں سے روٹھ جاتی ہے، یعنی قوتِ گویائی ساتھ نہیں دیتی (کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے) اور ہم لاکھ لاکھ اسے مناتے ہیں (یعنی بات کرنے کی سعی و کوشش کرتے ہیں) مگر وہ کسی طرح نہیں ہوتی۔ اب کوئی بتاؤ کہ ایسے خوشامد طلبوں (یعنی قوتِ گویائی) سے کس طرح عہدہ برآ ہوا جائے۔ ہم تو اس کے ہاتھوں سخت تنگ آ گئے ہیں۔

کاش یہ کبھی تو ہمارا ساتھ دے کہ ہم اپنے معشوق سے اپنا حالِ دل کہہ سکیں۔ اس شعر کے ساتھ یہ شعر بھی سامنے رکھیے گا۔ ؎

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے ۔۔۔ کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

یہ ملحوظ رہے کہ جو جتنا زیادہ روٹھا کرتا ہے، وہ اتنا ہی زیادہ خوشامد طلب ہوا کرتا ہے۔"

عرشی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

حضرت آثر لکھنوی نے اس شعر کے معنی یوں بیان فرمائے ہیں :-

شعر کا پسِ منظر یہ ہے کہ معشوق غالب کی موجودگی میں اُن کو سُنا کر کہتا ہے کہ غیر کو مجھ سے محبت ہے۔ یہ امر (غیر کی محبت) ایسا بدیہی ہے کہ معشوق کے مزاج داں غالب چوکنا ہوتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس بظاہر سادہ غیر متعلق بیان کی تہ میں کوئی نہ کوئی فریب ضرور ہے۔ کوئی چال چلتا ہے۔ غور کرنے سے انکشاف ہوتا ہے کہ اس سادگی میں غضب کی پرکاری ہے اور بات بہت دور تک پہونچتی ہے۔ معشوق کا یہ قول محض ستانے یا جلانے کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف عاشق کی آزمائش ہے۔ یہ جُل دینا چاہتا ہے کہ میں بھی جل کر اور مشتعل ہو کر ادعائے عشق کروں اور ایسے فعل کا مرتکب ہوں جو خلاف شیوۂ عاشقی ہے، کیونکہ معشوق سے بالاعلان عشق جتانا بوالہوسی کے مرادف ہے۔ عشق اگر صادق ہے تو دل کی خبر دل کو ہوتی ہے۔ خود بقولِ غالب ع پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں ہیں۔ غالب پر معشوق کا مافی الضمیر تو روشن ہوگیا، اب دوسری مہم درپیش ہوئی کہ جواب کیا دیا جائے۔ خاموش رہتے ہیں تو ماضر جوابی ہی پر حرف نہیں آتا بلکہ نکتہ چیں معشوق آگ بگولا ہو کر کہے گا کہ اس کی بات کو ناقابل اعتنا سمجھا اس کان سُنا اُس کان اُڑا دیا۔ کھلا کھلا جواب دینا آدابِ عشق

وشانِ حسن دونوں کے منافی ہے۔ جواب ویسا ہی مبہم ہو جیسی معشوق کی بات گمگم ہے۔ ترکی بہ ترکی ہو۔ لہٰذا معترض اتنا کہتے ہیں کہ "ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے" جواب کی اہمیت اور بلاغت شعر کی ردیف ہی سہی میں گرہ ہے۔ اس نے غیر کے قول کی تکذیب کر دی اور اس کی محبت کو مشتبہ بنا دیا۔ "غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی" کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں یقین نہیں کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے، مگر یہ فرض کرتے ہوئے بھی کہ اس کو تجھ سے محبت ہے۔

"اس طرح وہ پہلو نکل آیا جس پر زور دے رہا تھا۔ غیر عاشق نہیں بلکہ بوالہوس ہے ورنہ اعلان محبت یا اقرار محبت نہ کرتا۔ اس کے ساتھ معشوق پر یہ چھینٹا آگیا کہ تو ایسا سادہ لوح ہے کہ اس کی بات کا یقین آگیا، یہی نہیں بلکہ مجھ سے بھی متوقع ہے کہ غیر پر رشک کروں اور جینے سے بیزار ہو جاؤں یا اسی کی طرح بے غیرت بن کر تجھ سے محبت جتاؤں تاکہ (اسی طرح) تیری نظر میں ذلیل ہو جاؤں۔ تو صاحب آپ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں نہ میں غیر کی طرح تنگ ظرف ہوں ضمناً یہ پہلو بھی نکل آیا کہ میرے عشق میں غیر کے علی الزعم خلوص ہے۔ نیز یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ تجھے بھی غیر کی محبت کے بے لوث ہونے کا یقین نہیں ورنہ مجھ سے چھپاتا۔"

اثر صاحب کی معنی آفرینیاں اپنی جگہ۔ یہ بہت جاذب توجہ اور دل کش ہیں لیکن انھوں نے شعر کو ایک چیستاں بنا دیا ہے اور شعر سے زیادہ اس کا مطلب سمجھنا دشوار ہو گیا ہے اور پھر حاصل شعر کیا نکلا؟ "عاشق کا جواب ویسا ہی مبہم ہو جیسی معشوق کی بات گمگم ہے۔" بالکل وہی بات جیسے

دو گونگے ایک دوسرے سے اپنے خواب بیان کر رہے ہوں اور تماشائی حیرت سے ان دونوں کا منھ تک رہے ہوں ۔ مودبانہ عرض کردں گا کہ غالب کا یہ انتہائی صاف اور سادہ شعر اثر صاحب کی نکتہ سنجیوں کا کسی طور سے متحمل نہیں ہوتا ۔ اس کی سادگی اور پرکاری میں اس کے مطلب سے زیادہ طرز ادا کا دخل ہے ۔ میں اس کے معنی یہ سمجھتا ہوں :۔

" معشوق عاشق سے کہتا ہے کہ تجھے نہیں بلکہ غیر کو مجھ سے محبت ہے عاشق طرح طرح سے اپنی محبت کا ثبوت پیش کرتا ہے ۔ لیکن معشوق مانتا ہی نہیں اور غیر ہی کی محبت کا دم بھرتا رہتا ہے ۔ بالآخر جب کوئی دلیل کارگر نہیں ہوتی تو اتمام حجت کے لیے کہتا ہے " اچھا ہم تیرے کہنے سے یہ مانے لیتے ہیں کہ غیر کو تجھ سے محبت ہے لیکن خدارا اس پر تو ذرا غور کر کہ اگر ہمیں تجھ سے محبت نہیں تو کم از کم خود اپنے آپ سے تو عداوت نہیں ہو سکتی تھی پھر ہم نے جو اپنی ساری زندگی تباہ و برباد کر کے اپنی یہ حالت زار بنا رکھی ہے تو کس لیے ؟ کیا ہماری صورت حال ہماری محبت کا ناقابل تردید ثبوت نہیں ؟ عاشق کی زبوں حالی مسلمات شاعری میں سے ہے ۔ ضمناً یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ غیر کے محض کہہ دینے سے کہ اُسے محبت ہے معشوق اس کی محبت کا گرویدہ ہو گیا ، لیکن میں جو معشوق پر اپنا سب کچھ لٹائے بیٹھا ہوں مگر زبان سے کچھ بھی نہیں کہتا تو وہ میری محبت کا قائل ہی نہیں ہوتا "

اثر صاحب کا یہ فرمانا کہ معشوق سے بالاعلان عشق جتانا بوالہوسی کے مرادف ہے صحیح نہیں ہے ، خود غالب نے صاف صاف کہا ہے ۔

ع :- جان تم پر نثار کرتا ہوں

ع :- تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ

آسی صاحب نے اس شعر میں یہ نکتہ نکالا ہے کہ :-

"غیر کو تجھ سے محبت ہے تو سہی، ہم بھی جانتے ہیں مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہیں، ہم بھی تو اپنے ہی ہیں، ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے پھر ہم کو اس کے مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے"

لیکن شاعر کا اگر یہ مفہوم ہوتا تو پہلا مصرع بقول آثر صاحب۔

ع :- ہم بھی دشمن تو نہیں، اپنے ہیں۔ ہوتا نہ کہ

ع :- ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے۔

نیاز فتحپوری کا خیال ہے کہ اس شعر میں غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "چلو مان لیا کہ غیر کو تم سے محبت ہے لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ مجھے محبت نہیں ہے۔ کیونکہ تجھ سے میرا نہ محبت نہ کرنا خود اپنے آپ سے دشمنی کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص آپ اپنا دشمن نہیں ہو سکتا۔ غیر کا تجھ سے محبت کرنا تو صرف لطف محبت کے لئے ہے۔ لیکن میرا محبت کرنا تو میری مجبوری ہے کیونکہ وہی میری زندگی ہے"

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کو خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

اثرؔ لکھنوی نے اس شعر کے معنی یوں بیان فرمائے ہیں :-

"غالبؔ جنت کے نہیں بلکہ عام تصورِ جنت کے منکر ہیں ۔ یہ کوئی مخصوص جائے آسائش نہیں بلکہ قرب کی منزل ہے ۔ نفسِ مطمئنہ کی ایک کیفیت ہے۔"

پروفیسر سلیم چشتی کا اس شعر کے متعلق یہ خیال ہے :-

"ہم جانتے ہیں کہ درا صل جنت کا کوئی وجود نہیں ہے لیکن دل کے خوش رکھنے کو یہ خیال بہت اچھا ہے کہ دنیا میں جس قدر تکلیفیں اٹھائی ہیں اُن کا نعم البدل جنت میں مل جائے گا ۔ بالفاظ دیگر بانیانِ مذہب نے سادہ لوحوں کو سبز باغ دکھایا ہے"

الفاظ کے معمولی تغیر کے ساتھ دیگر شارحین نے بھی قریب قریب یہی معنی بتائے ہیں ۔

میری رائے میں اس شعر کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے یعنی جنت کے اعتقاد پر طنز اس کے پیش نظر لفظ "لیکن" کا استعمال برمحل نہیں ہے ۔ اس کے بجائے کوئی دوسرا لفظ جیسے "یعنی" یا "بے شک" وغیرہ آسانی سے رکھا جا سکتا تھا ۔ غالبؔ الفاظ کے انتخاب میں بڑے محتاط اور نکتہ رس واقع ہوئے تھے ، اور پھر ایسے معرکہ آرا شعر کے متعلق وہ ہرگز لاپرواہ نہیں ہو سکتے تھے ۔ پہلے مصرع میں اس ٹکڑے " ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت "

کے بعد لیکن، کے صرف یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ شاعر جنت کی حقیقت سے انکار نہیں کر رہا ہے بلکہ اُسے اُس کے متعلق کوئی بات اور بھی کہنا ہے۔ شعر کی نثر کی جائے تو یہ ہوگی "ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے لیکن دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے" اور اس سے اس کا مطلب صاف نہیں نکلتا۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں اس کو پڑھنے کے لہجے کا بڑا دخل ہے۔ لیکن، کے بعد شاعر نے کچھ بات محذوف مقدر کر دی ہے۔ "ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت" کے بلند آہنگ دعوے کے بعد لیکن، کہہ کر شاعر تھوڑی دیر کے لئے سکوت اختیار کر لیتا ہے اور شعر کے عام مفہوم کے تحت اس سے کئی پہلو نکل آتے ہیں مثلاً

ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے (یعنی وہ کچھ بھی نہیں محض ایک واہمہ ہے) لیکن..... اس کو بتانے سے فائدہ؟ یا ہماری سننے گا کون؟ یا مذہبی عقائد کو ٹھیس لگے گی یا عوام کا ایک سہارا ختم ہو جائے گا یا کار خیر کی تحریک ختم ہو جائے گی۔

ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے (وہ مادی آسائش کی جگہ نہیں ہے) لیکن..... زاہد جو اس سے مادی آسائش کی توقعات لگائے بیٹھا ہے، ہماری بات پر کب کان دھرے گا۔

ہم کو جنت کی حقیقت معلوم ہے لیکن..... ہم بتانا نہیں چاہتے اور فقط یہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ دل کو خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اور اس طرح شاعر کچھ نہ کہنے کی آڑ میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے، یعنی جو لوگ ہماری جیسی بصیرت نہیں رکھتے اُن کے لئے جنت کے متعلق سبز باغ والا۔ وا تی تصور یا جذباتی خوش فہمی ہی مناسب ہے۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ بنے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

اس بظاہر آسان سے شعر کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا کہ بیشتر شارحین نے دوسرے مصرعہ کا سوالیہ نشان نظر انداز کرکے "تم کو چاہوں؟" کے ٹکڑے کو بعد کے ٹکڑے سے الگ نہیں سمجھا۔ اس کے بعد دونوں مصرعوں میں مشکل ہی سے کوئی ربط باقی رہ جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شارحین نے شعر کا مطلب بیان کرنے کی جو کوششیں کی ہیں وہ لطف سے خالی نہیں۔

مولانا حسرت موہانی ـــــــــ

"موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ کہ وہ تو خواہ مخواہ آئے ہی گی۔ تمھاری خواہش کرنا چاہتے ہیں کہ اگر تم نہ آؤ تو مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔"

نظم طباطبائی ـــــــــ

"موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ آئے بغیر نہ رہے گی، یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں تم نہ آؤ کہ پھر مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے یعنی اب میں آنے کو منع کردوں تو کس منہ سے بلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمھارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔

بیخود دہلوی ـــــــــ

موت کی میں کیوں راہ دیکھوں اس کا آنا لازمی ہے وہ بغیر انتظار کے

بھی اپنے وقت معین پر آکر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو ہمارا بلانا بھی ممکن نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارا بلانا موت کے آنے سے دشوار تر ہے۔"

آسی:۔

"یہ جو شب و روز موت کا انتظار کرتا ہوں یہ فضول ہے ...... وہ تو خواہ مخواہ آئے گی اور اس کے یقینی ہونے کا سبب اور اس کو بُلانے کی تدبیر یہ ہے کہ میں یہ چاہوں یعنی اس بات کی خواہش کروں کہ تم نہ آؤ تو اس خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ مجھ سے ناراض ہو جاؤ گے اور پھر منھ نہ پڑے گا کہ میں تم کو بُلاؤں اور پھر اس صدمے سے لازمی مجھے موت آجائے گی۔"

سعید:۔

"میرے اوپر شبِ انتظار میں جو کلفت ہے وہ صرف دو صورت سے رفع ہو سکتی ہے یا تم آؤ یا موت لیکن تمھاری کیفیت یہ ہے کہ اگر نہ آؤ تو میں بلا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے تمھاری آمد کو کیوں چاہوں اور موت ہی کا راستہ کیوں نہ دیکھوں کہ وہ اس تکلیف میں یقیناً آکر رہے گی۔"

اسی طرح دوسرے شارحین نے بھی اس شعر کا مطلب بیان کرنے سے زیادہ اس کو مطلب پہنانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے مصرعہ میں تم کو چاہوں کے بعد سوالیہ نشان سے شعر کا مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے اور شعر کے دونوں مصرعوں میں کسی قسم کی کوئی بے ربطی

یا ابہام باقی نہیں رہتا۔

عاشق صادق کے لئے عشق کی آخری منزل پہ دو ہی باتیں باقی رہ جاتی ہیں موت یا معشوق۔ اور چونکہ معشوق کا ملنا موت کے آنے سے زیادہ مشکل نظر آتا ہے۔ لہذا وہ موت ہی کو ترجیح دیتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جب معشوق کے حصول کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تو اس کے فراق میں انگاروں پر لوٹنے کے بجائے عاشق اپنی موت کی تمنا کرتا ہے۔ اس تمنا میں کم سے کم یہ اطمینان ضرور رہتا ہے کہ یہ پوری ضرور ہوگی کیونکہ موت کا کبھی نہ کبھی آنا لازمی اور لابدی ہے۔ غالب زیر بحث شعر میں یہی بات اپنے معشوق کو سمجھاتے ہیں کہ تمھاری تمنا کرنے سے تو موت کی تمنا کرنا زیادہ بہتر ہے۔ تمھاری تمنا کا تو کوئی حاصل نظر نہیں آتا موت کی تمنا میں یہ بھروسہ تو شریک حال ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی آ ہی جائے گی۔

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ آخر میں موت ہی کا انتظار کیوں نہ کروں اس کے انتظار میں کم سے کم یہ اطمینان تو ہے کہ وہ بغیر آئے نہ رہے گی۔ اس کی تمنا کرنے کا مقصد کبھی نہ کبھی تو پورا ہو جائے گا۔ اس کے مقابلے میں تمھاری تمنا میں کیوں کروں؟ تم نہ آنا چاہو تو پھر میری کیا مجال جو تم کو بلا سکوں۔ تم اپنی ضد کے سامنے کسی کی سنتے ہی نہیں۔ موت سے یہ توقع ہے کہ وہ جلدی یا بہ دیر کبھی میری خواہش ضرور پوری کرے گی لیکن میں تم سے تمھارے برتاؤ کی وجہ سے ایسی کوئی توقع باقی نہیں رہی ہے۔ لہذا میں اب تمھاری تمنا کیوں کروں؟ صبر و شکر سے موت ہی کا

انتظار کیوں نہ کروں؟

خود غالب نے اس شعر کا یہی مفہوم اپنے ایک دوست منشی نبی بخش حقیر کو لکھا تھا۔ شعر کا حاصل یہ بتایا تھا کہ "گویا یہ عاجز معشوق سے کہتا ہے کہ اب میں تم کو چھوڑ کر اپنی موت کا عاشق ہوا ہوں، اس میں خوبی یہ ہے کہ بن بلائے، بغیر آئے نہیں رہتی۔"

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب!
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

غالب کے اس شعر کے متعلق آثر لکھنوی صاحب کا خیال ہے کہ وہ میر کے اس شعر سے متاثر نظر آتا ہے ؎

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رفتن
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

کسی کے نئے یا اچھے خیال سے متاثر ہونا کوئی عیب نہیں ہے بلکہ اگر اس خیال کو ترقی دے کر بہتر طریقے سے پیش کر دیا جائے تو یہ ایک ہنر ہے۔ علاوہ ازیں مجھے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کہ غالب کا شعر میر کے شعر کی عکاسی کرتا ہے۔ دونوں میں صرف معشوق کو خدا کے حوالے کرنے کا خیال مشترک ہے ورنہ دونوں ہی میں بالکل جداگانہ باتیں کہی گئی ہیں۔ میر اور غالب کے زمانے میں یہ مجلسی آداب میں داخل تھا کہ اپنے کسی عزیز یا دوست کو رخصت کرتے وقت "خدا کے سپرد کیا" کہا کرتے۔ لہٰذا معشوق کو خدا کے حوالے کرنے کا خیال بہت عام اور پیش پا افتادہ تھا اور اس کے لئے کسی کو کسی کی عکاسی کرنے کی مطلق ضرورت نہیں تھی۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس عامۃ الورود خیال کو بنیاد بنا کر میر نے کیا کہا ہے اور غالب نے کیا کہا ہے۔ میر نے اس کے متعلق پہلے کہا تھا، لہٰذا یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ غالب نے اس کو بہتر صورت میں

اور ترقی دے کر کہا ہے یا نہیں۔

میر کے شعر میں 'خدا کے حوالے کرنے' کے خیال سے متعلق بنیادی الفاظ 'عشق' اور 'غیرت' ہیں۔ عشق کے معنی محبت کے علاوہ شاباشی کے بھی ہیں۔ میر اُن چاہنے والوں کو شاباشی دیتے ہیں یا قابل تعریف سمجھتے ہیں جو اس غیرت میں کہ اپنے معشوق کو کسی دوسرے کو کیسے سونپا جائے اُس کو رخصت کرتے وقت خدا کے سپرد کرنا بھی گوارا نہیں کرتے معشوق کے معاملے میں اُن کا احساس ملکیت اس قدر شدید ہے کہ وہ خدا کو بھی غیر سمجھتے ہیں اور معشوق کو اس کے بھی سپرد کرتے ہوئے انھیں غیرت محسوس ہوتی ہے۔ شعر میں 'غیرت' کا لفظ ایک حیثیت سے بہت خوب استعمال ہوا ہے لیکن دوسری حیثیت سے اس نے شعر کے مفہوم کو محدود بھی کر دیا ہے۔ مطلب یہ کہ معشوق کو خدا کے حوالے کرتے وقت صرف جذبۂ غیرت مانع آتا ہے۔

غالب ایک ڈرامائی صورت حال پیش کرتے ہیں۔ کیسی قیامت کی بات ہے کہ ان کا معشوق اُن کے رقیب کا ہم سفر بن رہا ہے۔ وہ اس صورت حال کو کیسے برداشت کرلیں جب وہ اس 'کافر' کو خدا کے سپرد کرنا بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ 'کافر' کا لفظ یہاں پر الہامی اور لاجواب ہے۔ 'کافر' کو 'خدا' کے سپرد نہ کیا جاسکنا اپنا جواب نہیں رکھتا۔

معشوق کو خدا کے سپرد نہ کئے جانے کی جو تاویل میر نے پیش کی تھی یعنی معشوق کے معاملے میں عاشق کا احساس ملکیت اس قدر شدید ہوتا ہے کہ

وہ خدا کو بھی غیر سمجھتا ہے، اور اس کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے بھی غیرت محسوس کرتا ہے، یہ بات تو غالب کے شعر میں بہتر اور ترقی یافتہ انداز بیان کے ساتھ موجود ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اس میں غضب کا رمز و کنایہ پایا جاتا ہے۔ معشوق کے خدا کے سپرد نہ کئے جانے کے کئی اور بھی وجوہ اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ایک بڑی شوخ اور بیباک بلکہ دریدہ دہنی والی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میرا معشوق ایسا توبہ شکن اور غارت گر ایمان ہے کہ اس کے متعلق دنیا کے کسی متقی اور پرہیز گار پر کیا خود خدا تک پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

میر کا شعر جو اپنی جگہ پر کافی رنگین اور پُر لطف نظر آتا ہے، غالب کے بھرپور اور پہلو دار شعر کے مقابلے میں بہت پھیکا پڑ جاتا ہے۔ میر نے 'غیرت' کو درمیان میں لا کر صرف ایک پہلو پر نظر رکھی اور ان عاشقوں کو جو مارے غیرت کے اپنے معشوق کو خدا کے بھی حوالے نہیں کرتے محض شاباشی دینے پر اکتفا کی ہے۔ غالب نہ صرف زیر بحث خیال کے ہر پہلو پر حاوی ہو جاتے ہیں بلکہ پس منظر میں ایک ڈرامائی صورت حال بھی پیش کر دیتے ہیں جو ان کے شعر کو کہیں سے کہیں پہونچا دیتی ہے۔ کافر اور خدا کے الفاظ کے ساتھ 'قیامت'، کا لفظ بھی خوب استعمال ہوا ہے۔ حسن معنی کے علاوہ حسن بیان میں بھی میر کا شعر غالب کے شعر سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔

غالب قابل سرزنش نہیں بلکہ لائق تحسین ہیں کہ انھوں نے میر جیسے یگانۂ روزگار کے اپنائے ہوئے مضمون پر بھی طبع آزمائی کی تو اُسے فرش سے عرش پر پہونچا دیا۔ نقل اور عکاسی کرنا یقیناً آسان ہے لیکن کسی

شہ پارے کے مقابل اس سے بڑھ چڑھ کر دوسرا شہ پارہ پیش کر دینا صرف ہمت دشوار پسند ہی کا کام ہو سکتا ہے۔

میں شاعروں کے مدارج مقرر کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ کسی چمن میں جا کر ہر پھول کے رنگ و بو اور حسن سے محظوظ ہونے کے بجائے اگر کوئی شخص اس کاوش میں لگ جائے کہ کون پھول کس سے بہتر یا بدتر ہے تو یہ بدمذاقی نہیں تو اور کیا ہوگا؟ میں خود غالبؔ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں میر تقی میرؔ کے نشتروں کا گھائل اور ان کے مرتبۂ شاعری کا معترف اور معتقد ہوں اور جو لوگ ان کو غالبؔ پر ترجیح دیتے ہیں اُن سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی اُن کو خلوص نیت کا پورا فائدہ دینے کے لیے بھی تیار رہوں۔ البتہ اس وقت تعجب ضرور ہوتا ہے جب اکثر دلائل کے بجائے ان حضرات کی جانب یہ کہا جاتا ہے کہ خود غالبؔ نے اپنے اوپر میرؔ کو ترجیح دی تھی اور اس کے جواز میں یہ شعر پیش کیا جاتا ہے،

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ یقیناً میرؔ کے مداح اور معتقد تھے۔ میرؔ تو خیر اُن کے پیش رو، بزرگ اور ایک مسلم الثبوت استاد تھے وہ ذوقؔ، مومنؔ، ناسخؔ، آزردہؔ اور شیفتہؔ وغیرہ اپنے ہم عصر شعرا کی شاعرانہ صلاحیتوں کے بھی مداح اور معتقد تھے اور جو نہ ہوتا اُسے بلا تکلف "بے بہرہ" سمجھتے۔ ذوقؔ کے لیے ایک دفعہ بہت جل کر کہا تھا ؎

راست می گویم من واز راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست، آں ننگ من است

لیکن انھوں نے اپنے خطوط میں اکثر ذوق کے اشعار لکھے ہیں اور ان کی تعریف بھی کی ہے، اور اسی طرح انھوں نے اپنے دیگر ہم عصروں کی تعریف و توصیف میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا۔ مفتی صدرالدین آزردہ کے لیے تو یہاں تک لکھ دیا تھا۔ ع

آں کہ ننگ اوست بودن، در سخن ہمتائے من

ایک وسیع النظر فن کار کے لیے ضروری نہیں کہ وہ صرف اپنے سے بہتر ہی فنکار کا معتقد ہو، وہ اپنے ہم پلہ یا اپنے سے کم تر فن کار کا بھی معتقد ہو سکتا ہے۔ معتقد ہونے کے معنی صرف اعتراف کمال ہیں نہ کہ بطور شاگرد زانوئے ادب تہ کرنے کے، کسی کے کمال کے اعتراف کرنے سے یہ قطعی نتیجہ بھی نہیں نکلتا ہے کہ معترف اس کا ہم مذاق بھی ہے اور اس کمال کو حاصل کرنا یا اس کی پیروی کرنا اپنے لیے ضروری بھی سمجھتا ہے۔

غالب کی شاعری میں ہمیں یقیناً ایک ایسا دور ملتا ہے جب وہ میر تقی میر کے سادہ اور پُرکار حسن بیان سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں لیکن ان کے اور میر کے افتاد مزاج اور زندگی کے اقدار کے شعور میں بہت بڑا فرق تھا۔ وہ اس دور سے بہت جلد آگے نکل گئے۔ منشی نبی بخش حقیر کو یہ غزل

سب کہاں، کچھ، لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

بھیجی تو اُس کے ساتھ یہ بھی لکھا "خدا کے واسطے، داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میر اور مرزا کیا کہتے تھے؟ اگر وہ ریختہ تھا تو پھر یہ کیا ہے؟" اور اسی طرح حقیر کو ایک دوسری غزل بھیجتے ہوئے لکھا: "داد دینا، کہ اگر ریختہ پایۂ سحر یا اعجاز کو پہونچے تو اس کی یہی صورت ہوگی یا کچھ اور؟"

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ موضوعات سخن سے قطع نظر غالب انداز بیان اور خصوصاً سہل ممتنع کہنے میں بھی اپنے کلام کو میر کے کلام پر ترجیح دیتے تھے، لیکن اس سے یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہونا چاہیئے کہ وہ میر کے معتقد یا معترف نہیں تھے ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
سُنتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اس شعر کے متعلق لکھا ہے :۔

" جو لوگ کہ گرم معتدل فرشِ ارض پر رہنے کے عادی ہیں، وہ ان لوگوں کی پاک اور خوف آمیز مسرت کو کیا جان سکتے ہیں جو فنونِ لطیفہ کی سرد اور بے داغ برف سے ڈھکی ہوئی مرتفع چوٹیوں پر گشت لگا رہے ہیں۔ کانٹ نے خوب کہا ہے کہ بہت سے اشعار ایسے ہوتے ہیں، جن میں آزاد حسن ہوتا ہے۔ وہ پھولوں کی طرح اپنے معنی نہیں بیان کرتے بلکہ اپنی خوشبو سے مشامِ جان کو مسرور کرتے ہیں۔ اگر ان کی نثر کرنے اور ان کے مطالب دریافت کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کوشش ایسی ہوگی جس طرح کوئی شخص پھولوں کی خوشبو کو پانے کی غرض سے ان کی پتیوں (پنکھڑیوں) کو توڑ کر علٰحدہ کرے۔ بعض اوقات انسان پر ایک کیفیت طاری ہوتی ہے کہ اس کیفیت میں خواب کی سی حالت ہوتی ہے قوتِ متخیلہ ادراک پر غالب آجاتی ہے اور عجب پر لطف پریشان مطلب مظاہر پیش کرتی ہے۔

غالب نشے کو نخل کی طرح شاداب اور ساز کو مے گسار کی طرح مست بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شیشۂ مے سرود (نغمہ) کے جوئبار پر ایک سروِ سبز ہے۔

"بودلیر BAUDELAIRE لکھتا ہے شاعرانہ کیفیت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب تمام حواس نہایت درجہ تاثرات پذیر اور ذکی الحس ہو جاتے ہیں.... جملہ اشیائے عالم اپنی صورت سے بسا اوقات دوسری صورتوں میں منقلب ہو جاتی ہیں، آوازیں رنگین معلوم ہونے لگتی ہیں اور رنگ میں نغمہ پیدا ہو جاتا ہے، غالب کو نشہ شاداب اور ساز مست اور نغمۂ آبِ رواں اور جام سروِ سبز نظر آتا ہے۔"

تسلیم چشتی نے اس شعر کا مطلب یوں بیان کیا ہے :-

"شراب کے نشے میں رنگینی اور سرور ہے، ساز وفورِ مسرت سے مست ہے، یعنی شراب میں نغمہ کی اور نغمہ میں شراب کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور شیشۂ مے کیا ہے؟ گویا ایک سرو ہے جو نغمے کی ندی کے کنارے اُگا ہوا ہے یعنی اپنی بہار دکھا رہا ہے۔"

نیاز فتحپوری کا اس شعر کے متعلق ارشاد ہے :-

"غالب نے اس شعر میں محفلِ طرب کی مسرت و نشاط کا تذکرہ کیا ہے کہ ہر شخص نشے میں چور ہے۔ مطربوں کے ساز سے مستی ٹپک رہی ہے۔ شیشۂ شراب سرو نظر آتا ہے اور نغمہ جوئبار کی طرح جاری ہے۔"

کئی شارحین نے اس شعر کو مغلق اور بے معنی قرار دیا ہے لیکن کم سے کم اُردو شاعری اور خصوصاً غزل میں یہ شعر اپنی نوعیت کا ایک انوکھا شعر ہے شاعر نے اپنے لطف و انبساط کی کیفیت کو نادر تشبیہات میں ایک عجب انداز سے بیان کیا ہے۔ اس کیفیت کو سمجھا جا سکتا ہے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
داغِ دلِ بیدرد، نظرگاہِ حیا ہے

پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے اپنی شرح دیوان غالب میں اس شعر کے متعلق عجیب و غریب تنقید کی ہے :-

چونکہ اس شعر میں غالب نے اپنے مفہوم کو ان الفاظ سے ادا کیا ہے جن سے وہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اس لئے شعر مغلق ہو گیا اور یہ اغلاق ہی 'غالب ازم' یعنی اُن کی خصوصیت ہے ۔"

اس کے بعد شعر کا مطلب یوں لکھا ہے :-

" جب گل لالہ نے اس بات پر غور کیا کہ میرے دل میں داغ تو ہے مگر درد نہیں یعنی یہ داغ حقیقی نہیں بلکہ مصنوعی ہے تو اُسے شرم محسوس ہوئی جس کی وجہ سے وہ عرق عرق ہو گیا بہ الفاظ دیگر جسے لوگ شبنم سمجھتے ہیں وہ دراصل عرق خجالت کی بوندیں ہیں ۔"

چشتی صاحب نے اس شعر کے مغلق ہونے کی جو وجہ بتائی ہے ۔

" غالب نے اپنے مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے جن سے وہ مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اس لئے شعر مغلق ہو گیا ۔" وہ بالکل غلط ہے ۔ اگر کسی شعر سے کوئی مطلب ہی نہیں نکلتا تو وہ مغلق نہیں بلکہ مہمل ہے اور اگر نکلتا ہے تو شارح کو صرف وہ مطلب بیان کر دینا چاہئے اور اس محمل غرسانی کی ذمہ داری اپنے سر نہ لینا چاہیئے کہ درحقیقت شاعر کہنا کیا چاہتا تھا ۔

مغلق تو ہم صرف اُس شعر کو کہہ سکتے ہیں کہ جس میں شاعر نے اشاروں اور کنایوں سے کوئی بات کہنا چاہی ہو یا کسی پیچیدہ اور دور از کار مضمون کو پیش کرنے کی کوشش کی ہو یا غیر مانوس مفروضات پر اپنے دعوے کی بنیاد رکھی ہو اور اس طرح اپنے مافی الضمیر کو بعید از فہم بنا دیا ہو۔ غالب کے زیر بحث شعر میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نظم طبا طبائی، حسرت موہانی، بیخود موہانی، اثر لکھنوی، نیاز فتحپوری، آسی وغیرہ وغیرہ جیسے صاحبان علم و ادب نے اس شعر کی شرح لکھی ہے اور کسی نے اس کو مغلق نہیں قرار دیا ہے بلکہ بیشتر نے اسے قابل تحسین سمجھا ہے۔

یہ ٹکڑا کہ "اغلاق ہی غالب از م یعنی غالب کی خصوصیت ہے" نہ صرف حقیقت سے بعید بلکہ دیوان غالب کے ایک شارح کے منھ سے تعجب خیز ہے۔ کسی مشکل مضمون کو بیان کرنے کے لئے بسا اوقات مشکل الفاظ ہی کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ غالب قابل صد آفریں ہیں کہ انھوں نے عام روش سے ہٹ کر نازک اور پیچیدہ مضامین پر طبع آزمائی کی اور اس سلسلے میں اگر انھیں مشکل الفاظ استعمال کرنا پڑے تو وہ اس کے لئے مجبور تھے۔ انھوں نے محض مشکل الفاظ سے مضمون کو دقیق نہیں بنایا بلکہ دقیق مضمون کے لئے مشکل الفاظ استعمال کئے ہیں۔

عبدالباری آسی صاحب نے ان کے اس قسم کے کلام کے لئے فرمایا ہے:-

"یہ وہ کلام ہے جو مرزا کو عوام کی صف سے علیحدہ کر کے زمرۂ خواص میں لے آتا ہے اور ان کی تخیل کی رفعت کا اندازہ کراتا ہے اور

ان کی وسعت نظر کی شہادت دیتا ہے۔"

"غالب ازم" کو "غالب کی خصوصیت" بتانا ویسا ہی ہے جیسے بیخ بادیان کی جڑ کہنا۔

شعر زیر بحث میں خاص ٹکڑے حسب ذیل ہیں :۔

نہ خالی نزادا ہے :۔ اداسے خالی نہیں ہے۔ بے مطلب نہیں ہے۔ کوئی خاص معنی رکھتی ہے یا نشان دہی کرتی ہے۔

دل بے درد :۔ دل جو درد سے خالی ہے (آثر لکھنوی۔ نظم طباطبائی اور دیگر شارحین)۔

سنگ دل۔ جسے دوسروں کی مصیبت پر ترس نہ آئے۔

(بیخود موہانی)

نظرگاہِ حیا :۔ حیا کی نظر پڑنے کی جگہ۔ باعث ندامت۔ قابل شرم

(تمام دیگر شارحین)

اُمید گاہِ حیا۔ جس سے حیا کی اُمیدیں وابستہ ہوں۔

(بیخود موہانی)

بیخود موہانی نے اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے کہ لالہ پر اُوس کی بُوندیں یہ مطلب ادا کر رہی ہیں کہ بے دردوں کے داغ ہی سے حیا کی اُمیدیں وابستہ ہیں ..... یعنی جب بے درد خود کوئی صدمہ اُٹھاتا ہے تو اُس کو عاشقوں یا مظلوموں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہی احساس اس کو اپنے گزشتہ بے دردانہ طرز عمل پر شرمندہ کرتا ہے اور

جوشِ پشیمانی سے پیشانی عرق آلود ہو جاتی ہے۔ بے درد کی یہی ادا ہے کہ اہلِ دل اس کے صلے میں اس کی تمام بُرائیوں پر خاک ڈال دیتے ہیں اور ان کو اس پشیمان ظالم پر پیار آنے لگتا ہے۔ مصیبت بے رحموں کے لیے رحمت ہے، اس لیے کہ رقّتِ قلب پیدا کرتی ہے۔"

دیگر شارحین نے کم و بیش یہ معنی بیان کیے ہیں :-

"لالے کے پھول پر شبنم کے قطرات ایک خاص مطلب ادا کر رہے ہیں یعنی عرقِ انفعال معلوم ہوتے ہیں کیونکہ لالے کے دل میں داغ تو ہے لیکن اس میں درد نہیں ہے اور یہ بات اس کے لیے باعثِ شرمندگی ہے۔"

جیسے یہاں لالے کے داغ کو بوجہ اس کے کہ اس میں درد نہیں ہے اور محض نمائشی ہے غالبؔ نے قابلِ شرم بتایا ہے، اسی طرح غیر متداول کلام کے ایک شعر میں پھول کے زخم کی تحقیر کی ہے۔ ؎

ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد؟

دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بُتِ بدمستِ حنا ہے

اس شعر کی تشریح بعض شارحین نے یوں کی ہے :-

مولانا شوکت :-

" دل کشمکشِ حسرتِ دیدار سے بُتِ بدمست حنا کے ہاتھ میں آئینہ بنا ہوا ہے۔ یعنی اس کے تغافل کو کھول رہا ہے کہ وہ تو حنا لگانے کے شوق میں بدمست ہے، اور یہاں حسرت دیدار میں دل کا کس قدر خون ہو رہا ہے ۔ بدمست حنا بُت کی صفت ہے "

حسرت موہانی :-

(۱) دل اور آئینہ کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے کہ ایک ہمارا دل ہے کہ خوں شدہ کشمکش دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اُس بدمست حنا کے ہاتھ میں ہے ۔

(۲) دل حسرت دیدار میں خون ہو کر بصورت حنا اُس کے ہاتھ میں آئینہ بن گیا ۔

نظم طباطبائی :-

" آئینۂ دل مہندی بن گیا یعنی حسرت دیدار نے اُسے پیس ڈالا، اور اس کے جگر کو لہو کر دیا۔ دل کو آئینہ بنا کر پھر اُسے حنا بنا دیا بہت ہی تصنع ہے اور بے لطف "

بیخود موہانی: ____________

انھوں نے اس شعر کے کئی دل آویز معنی بتائے ہیں جن میں کچھ درج کئے جاتے ہیں۔ معشوق اپنے جمال کی دلربائیوں کے نظارے میں ایسا محو و بیخود۔ مست و مدہوش ہو رہا ہے کہ آئینہ اس کے ہاتھ میں یوں بے حس وحرکت قائم ہے جیسے رنگ حنا کف دست پر اور حسرت دیدار کی کشمکش نے عشاق کے دلوں کو لہو کر رکھا ہے۔

معشوق اپنے مہندی رچے ہوئے ہاتھوں کو اس محویت سے دیکھ رہا ہے جس محویت سے بتان خود پرست آئینہ دیکھتے ہیں اور حسرت دیدار عشاق کا دل لہو کئے دیتی ہے۔

کشمکش حسرت دیدار مشتاقان دید کے دل لہو کئے دیتی ہے اور معشوق کو خود آرائی کا اس قدر شوق ہے کہ آئینہ اس کے ہاتھ میں مہندی بن کر رہ گیا ہے یعنی کسی وقت اس کے ہاتھ سے چھوٹتا ہی نہیں۔

حنا اس بدمست کے ہاتھ میں آئینہ بنی ہوئی ہے۔ آئینہ کو بے حس و حرکت ہونے کی بنا پر حنا کہنا یا حنا کو معشوق کی محویت کے اعتبار سے آئینہ قرار دینا وہ انداز تکلم ہے جو بہی شاعروں کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ شعر کے الفاظ نہیں شاطر نے سمجھ کر مہرے ڈال دیے ہیں۔ ایک لفظ سے دوسرے لفظ کو زور دیا جا رہا ہے۔ لفظ کشمکش سے دل کے لہو ہونے کی تصویر آنکھوں میں

بھرنے لگتی ہے۔ کشمکش یہ ہے کہ معشوق کی محویت کا تقاضا ہے کہ اس تمنا سے درگزر رو، اور حسرت دید کہتی ہے کہ بے دیکھے پلٹنا حرام ہے۔ مرزا کا یہ شعر معشوق کی خود پرستی اور جمال کی محویت کے متعلق جواب نہیں رکھتا۔ بعض حضرات کو اس کے سمجھنے سمجھانے میں اس لئے دقت پیش آئی کہ انھوں نے بدمست حنا کو اضافت کے ساتھ پڑھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس شعر میں تشابہات بھی جمع ہو گئے ہیں مثلاً دل اور آئینہ کی تشبیہ عام ہے، دل خوں شدہ اور حنا میں تشبیہ موجود ہے "

آثر لکھنوی :-

آپ نے اس شعر کا مطلب بیان کرنے میں ایک نئی بات پیدا کی ہے۔ "معشوق کے ہاتھوں کا رنگِ حنا اُس پر میرے دل کا حال (آئینہ) عیاں کر رہا ہے کہ جس طرح اس کے ہاتھ مہندی ملنے سے سُرخ ہو گئے اُسی طرح میرا دل کشمکشِ حسرتِ دیدار میں خون ہو رہا ہے تاہم وہ اپنے مہندی لگے ہاتھوں کے نظارے میں ایسا محو ہے کہ میرے حال سے بے خبر ہے "

مگر اس موقع پر آئینہ کو عیاں کرنے کے معنی میں سمجھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ شعر کے معنی یوں بھی صاف ہیں۔ دل اور آئینہ میں جو تعلق ہے وہ ظاہر ہی ہے۔ پھر آئینہ کو کسی دوسرے معنوں میں لے جانا بڑا اغلط مبحث ہو جائے گا۔ اور شعر کی ندرت کو ٹھیس لگے گی۔

پروفیسر سلیم چشتی :۔

آپ نے اس شعر کا مطلب یوں سمجھا ہے :۔

"بُت بدست کے ہاتھ میں جو آئینہ ہے اُسے آئینہ مت سمجھو، بلکہ حنا سمجھو یعنی آئینہ نہیں ہے بلکہ حنا ہے، کیونکہ حنا کی طرح اس کا دل بھی خون (سُرخ) ہو گیا ہے اور وجہ دل کے خون ہو جانے کی یہ ہے کہ وہ کمال قرب کے باوجود لذتِ دیدار سے محروم ہے"

اس قسم کی تشریح کے ساتھ چشتی صاحب کا یہ بھی ارشاد ہے کہ :۔

"یہ شعر بھی غالب کے مغلق ترین اشعار میں ہے"

میں مودبانہ عرض کروں گا کہ اگر شعر مغلق ہے تو اس کی یہ شرح اس سے کہیں زیادہ مغلق ہے۔ یہ کس قسم کی شرح ہے "اُسے آئینہ مت سمجھو بلکہ حنا سمجھو یعنی آئینہ نہیں ہے بلکہ حنا ہے" یا "وجہ دل کے خون ہو جانے کی یہ ہے کہ وہ کمال قرب کے باوجود لذت دیدار سے محروم ہے" آخر کیوں؟ درحقیقت شعر مغلق ہرگز نہیں ہے بلکہ تشابہات جمع ہو جانے کی وجہ سے اس کے کئی معنی پیدا ہو سکتے ہیں جو سب کے سب زوردار اور پُر لطف ہیں۔ البتہ اس کے وہ معنی جو سلیم صاحب نے بیان کیے ہیں، دوسرے صاف اور بہتر مطالب کی موجودگی میں ذوقِ سلیم پر گراں گزرتے ہیں۔

غیر متداول کلام کا ایک شعر ہے ؎

بے خبر مت کہہ ہمیں بے درد خود بینی سے پوچھ
قلزم ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

حاشیہ:

میں عرض کرتا ہوں کہ یہ سب مطالب "شعر را نہ معدوسہ کہ برد؟" کے تحت آتے ہیں۔ چونکہ غالب کو گہرے تخیل کو مشکل الفاظ میں ادا کرنے کی عادت ہے اس لئے شارحین وہاں بھی اپنی طبع آزمائی سے باز نہیں آتے جہاں اس کی گنجائش بمشکل ہی پیدا کی جا سکتی ہے۔

یہاں غالب صرف اتنا ہی کہنا چاہتا ہے کہ ہمارا دل حسرت دیدار میں خون ہوا جا رہا ہے، مگر معشوق ابھی محو آرائش ہی ہے۔ ہمیں کامیاب دیدار نہیں کرتا۔ اسباب آرائش میں مہندی بھی ہے اور خون کے رنگ سے اُسے مناسبت ہے اس لئے اپنے دل کو خون شدہ کہا، تو معشوق کے ہاتھوں کو مہندی سے رنگین بتایا، جس میں ایک لطیف اشارہ ادھر بھی ہے کہ اس کے ہاتھ ہمارے خون میں آلودہ ہیں۔ بس اس سے زائد کہنا ضرور نہیں۔

عرشی

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

مولانا حالی لکھتے ہیں کہ میں نے خود اس (شعر) کے معنی مرزا سے پوچھے تھے فرمایا کہ "اے" کی جگہ "جز" پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے، یعنی قمری جو ایک کفِ خاکستر اور بلبل جو ایک قفسِ عنصری سے زیادہ نہیں ہے، ان کے جگر سوختہ یعنی عاشق ہونے کا ثبوت اُن کے چہکنے اور بولنے سے ہوتا ہے یہاں جس معنی میں مرزا نے "اے" کا لفظ استعمال کیا ہے یہ اُنھیں کا اختراع ہے۔ ایک شخص نے یہ معنی سُن کر کہا کہ اگر وہ "اے" کی جگہ "جز" لفظ رکھ دیتے یا دوسرا مصرع یوں کہتے "اے نالہ نشاں تیرے سوا عشق میں کیا ہے" تو مطلب صاف ہو جاتا۔ اس شخص کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے، مگر مرزا چوں کہ معمولی اسلوبوں سے بچتے تھے اس لئے وہ بہ نسبت اس کے کہ شعر عام فہم ہو جائے اس بات کو زیادہ پسند کرتے تھے کہ طرزِ بیان میں جدّت اور نرالا پن پایا جائے" (یادگارِ غالب)

مودبانہ گذارش ہے کہ مولانا حالی کے بیان کئے ہوئے مطلب سے شعر کا مفہوم بالکل واضح نہیں ہوتا بلکہ اور مغلق اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ چونکہ مولانا حالی نے غالب کے بتائے ہوئے معنی فوراً نہیں لکھ لئے تھے لہذا جب ایک مدّت کے بعد وہ ان کو یادگارِ غالب میں لکھنے بیٹھے تو اُن کے حافظے نے اُن کی خاطر خواہ مدد نہیں کی۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مولانا حالی نے یہاں تک تو غالب کا قول لکھا تھا کہ 'اے' کی جگہ 'جز' پڑھو معنی خود سمجھ میں آجائیں گے'۔ اور اس کے بعد 'یعنی قمری..... سے جو عبارت شروع کی تھی وہ غالب کی نہ ہو بلکہ محض وہ مفہوم ہو جو غالب کے بتائے ہوئے اشارے سے خود مولانا کی سمجھ میں آیا تھا۔

غالب کی زندگی میں آخری بار ان کا دیوان ۱۸۶۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مصرع اولیٰ میں 'قفس رنگ' کے بجائے 'قفسی رنگ' ہے امتیاز علی عرشی صاحب نے نسخۂ عرشی میں اس کو سہو کاتب تعبیر کیا ہے مجذوب موہانی نے گنجینۂ تحقیق میں اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ شعر کی معنویت کے لحاظ سے صحیح لفظ 'قفسی رنگ' ہے نہ کہ 'قفس رنگ'۔ مجذوب موہانی صاحب کا ارشاد زیادہ قرین قیاس ہے، اور اس کی تصدیق دیوان غالب کے ۱۸۶۳ء کے اڈیشن سے بھی ہوتی ہے، اور اس سے شعر کا مفہوم بھی ادا ہو جاتا ہے۔

قمری اور بلبل کا عاشق ہونا مسلمات شاعری میں سے ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ قمری کے عشق کا ثبوت اُس کا خاکستری رنگ ہے۔ بلبل کے عشق کا ثبوت اس کا 'قفسی' یعنی مٹیالا رنگ ہے۔ دونوں ہی کے رنگ ایسے ہیں جن سے اُن کے جلنے اور جل کر راکھ ہو جانے کی نشان دہی کی جا سکتی ہے اور بہر کیف ان کے عشق کا کوئی نہ کوئی ثبوت باقی رہ گیا ہے۔ لیکن اے نالہ میرے جگر سوختہ یعنی عشق کا میرے پاس کیا ثبوت ہے۔ نالہ کو یوں

مخاطب کیا ہے کہ وہی عشق کا ثبوت ہو سکتا تھا لیکن اس کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا۔

ماحصل یہ کہ قمری اور بلبل نے عشق کیا تو ان کے پاس ان کے عشق کی کوئی نشانی تو ہے اور اس کی بنا پر ان کو بحیثیت عشاق کچھ اعتبار تو حاصل ہے۔ لیکن میرے عشق کی مہجوری اور نامرادی ملاحظہ ہو کہ میرے جگر سوختہ کی میرے پاس کوئی نشانی بھی نہیں ہے اور میں اس اعتبار سے بھی محروم ہوں جو دیگر عشاق کے حصے میں آیا ہے۔ ضمناً یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میرے عشق میں کوئی عنصر نمائشی نہیں تھا بلکہ وہ سراسر بے لوث اور بے غرض تھا۔ یا میرا عشق ایسا کامل تھا کہ میں جلا تو راکھ اور خاک بھی باقی نہ بچی۔

بعض شارحین نے خصوصاً آثر لکھنوی اور نیاز فتحپوری نے اس پر بہت سخت اعتراض کیا ہے کہ غالب نے مولانا حالی سے کہا تھا کہ 'اے' کی جگہ 'جز' پڑھا جائے تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ آثر لکھنوی فرماتے ہیں "کوئی لغت اور کوئی محاورہ غالب کا ہم نوا نہیں کہ 'اے' کے معنی 'جز' ہیں"۔ نیاز فتحپوری کا ارشاد ہے "غالب نے بقول خود 'اے' بہ معنی 'جز' استعمال کیا ہے، حالانکہ اس معنی میں 'اے' کا استعمال کسی نے نہیں کیا اور یہ غالب کا اختراع ہے"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ان شارحین نے یہ انوکھی بات از خود کیسے پیدا کرلی کہ غالب نے 'اے' کے معنی 'جز' بتائے تھے۔ غالب کا قول تو صرف

اس قدر تھا" اسے کی جگہ "جز" پڑھو، معنی خود بخود صاف ہو جائیں گے"
اور یہ بالکل درست ہے، یہ جگر سوختہ کا نشان جز نالہ کچھ بھی نہیں ہے، یہ بات
ذہن میں رکھ لی جائے تو پھر فوراً سمجھ میں آجاتا ہے کہ چونکہ شاعر "نالہ" کو
کسی کے سامنے پیش نہیں کر سکتا لہٰذا وہ اپنی مجبوری اور نامرادی پر
اور زیادہ زور دینے کے لئے خود نالہ سے فریاد کرتا ہے کہ اب تو ہی
بتا کہ میں اپنے عشق کے ثبوت میں کیا پیش کروں۔ بالکل وہی بات ہے
جیسے کوئی شخص اس مفہوم کو کہ "جز خدا مجھے کسی کا آسرا نہیں" زیادہ
پُر اثر انداز میں یوں ادا کرے "اے خدا! بس تیرا ہی آسرا ہے"

"قفسی رنگ" کے بجائے "قفسِ رنگ" کو اگر مصرع اولیٰ میں صحیح
سمجھا جائے تو بھی شعر کے بنیادی مفہوم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قفسی رنگ
سے مراد ہے پنجرے کا ایسا رنگ یعنی مثلاً لایا کالا اور "قفسِ رنگ" سے
مطلب ہے کئی رنگوں کا مجموعہ یا رنگوں کا محض پنجرا یا بقول آثر لکھنوی
گل سے استعارہ ہے۔ شعر زیر بحث میں بلبل قفس رنگ سے مطلب یہ نکلے گا کہ
بلبل کے گل کے ساتھ عشق کا ثبوت یہ ہے کہ وہ محض چند رنگوں کا پنجرا
رہ گئی ہے (رنگ کی خاصیت اڑنے کی ہوتی ہے) یعنی اس کی حالت
خراب ہے یا وہ گل رنگ ہو گئی ہے اور معشوق کے ہم رنگ ہو جانا اس کے
عشق کا ایک بہت نمایاں ثبوت ہے۔ لیکن مجھے اس موقع پر "قفسی رنگ"،
"قفسِ رنگ" سے کہیں زیادہ مناسب اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب کے جملہ شارحین اس شعر کی تعریف اور توصیف میں ہم زبان ہیں حضرت نظم طباطبائی جنھوں نے اپنی شرح میں غالب پر بہت سی نکتہ چینیاں کی ہیں اور ان کے کئی اشعار کو بے معنی بتایا ہے، اس شعر کے متعلق فرماتے ہیں "اس شعر کی داد کون دے سکتا ہے؟ میر تقی کو بھی حسرت ہوتی ہوگی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لئے بچ رہا۔"

مولانا حالی نے اس کی شرح یوں لکھی ہے "یعنی جو گناہ ہم نے کئے ہیں اگر اُن کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت ہم نہیں کر سکے اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی اُن کی داد بھی ملنی چاہیے۔"

نجو دموہانی نے اس شعر کے مطالب یوں بیان کئے ہیں :—

(۱) کوئی گنہگار دنیا میں اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے وقت یا میدان حشر میں پرسش اعمال کے موقع پر کہتا ہے کہ اے میرے پروردگار اگر میرے کئے ہوئے گناہوں کی سزا دیتا ہے تو جن گناہوں کی حسرت رہ گئی (یعنی جو گناہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے یا تیرے خوف کے سبب سے یا تیری خوشنودی کے خیال سے نہیں کئے) پہلے اُسے نکال دے پھر جو سزا بھی چاہے دے لے میں خوشی سے بھگت لوں گا۔ اس شعر میں مرزا نے انسان کے ذوقِ گناہ کی انتہا دکھائی ہے۔

(۲) "پروردگار اگر میرے کئے ہوئے گناہوں کی سزا دینا ہے تو خیر، لیکن جن گناہوں کی حسرت رہ گئی اور ناکامیوں نے میرے دل پر جو قیامتیں توڑی ہیں، تو اُن سے خوب واقف ہے۔ جو گناہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے میں نے نہیں کئے اُس پر جو تکلیف میرے دل کو ہوئی، عجب نہیں جو میرے گناہوں کا کفارہ ہو گئی ہو، اور جو گناہ تیرے خوف سے نہیں کئے اور جن لذتوں کو تیری خوشنودی کے لیے ترک کیا اُن کا اجر ملنا چاہیے۔ فیصلہ کرنے میں یہ تمام اُمور مد نظر رہیں، عجب نہیں کہ میں جزا کا مستحق ٹھہروں، سزا کیسی؟ مرزا نے باز پُرس قیامت کے لیے قیامت کا جواب پیدا کیا ہے، اور کس بلیغ انداز سے اپنا مطلب ادا کیا ہے۔"

بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی، غالب زندگی کی پیاس کبھی نہ بجھا سکے شعر مندرجہ بالا اور اسی قسم کے اشعار ان کے ارمان انگیز افتاد مزاج کی بہت خوب عکاسی کرتے ہیں۔

ؔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دَم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کَم نکلے

ؔ آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد!
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ!

شعر زیر بحث میں سب سے زیادہ قابل غور بات یہ ہے کہ غالب کی زندگی کی مسرتوں سے لذت یاب ہونے کی خواہش اس قدر بے پناہ

ہے کہ وہ اپنے "کردہ گناہوں" کو "ناکردہ گناہوں" کے مقابلے میں ہیچ اور بے مقدار سمجھتے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے اپنا گناہوں سے سیاہ اعمال نامہ لے کر کھڑے ہوتے ہیں تو ملزم بن کر نہیں بلکہ مستغیث بن کر اور یہ شکایت لے کر کہ بہت سے گناہ جو اُن سے کرنے کو رہ گئے آخر اُن کے کرنے کی اُن کو قدرت کیوں نہیں بخشی گئی؟ اُن کی رائے میں اُن کے کردہ گناہوں کی سزا سے اُن کے ناکردہ گناہوں کی حسرت کی جزا کہیں زیادہ ہونا چاہیئے۔

شعر کے مصرعہ ثانی میں لفظ 'اگر' سے ترشح ہوتا ہے کہ شاعر کا دلی منشا تو یہ ہے کہ اس سے اس کے اعمال کی بازپرس ہی نہ کی جائے۔ لیکن اگر بہ تقاضائے انصاف ایسا کیا جانا لازمی ہو تو پھر اس بات کو بھی ملحوظ رکھا جائے کہ اس نے کردہ گناہوں سے جو لطف و انبساط اُٹھایا اُس سے کہیں زیادہ ناکردہ گناہوں کی محرومی پر رنج و تعب بھی برداشت کیا۔ اُسے کردہ گناہوں کی سزا کے ساتھ ناکردہ گناہوں کی جزا بھی ملنا چاہیئے۔

اس موقع پر ہری چند اختر کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے جو بہت خوب ہے ؎

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں
لے خدا میرے خدا تجھ کو خدا سمجھا تھا میں!

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

مولانا حالی کا ارشاد ہے "اُردو میں ایسے بلیغ اشعار شاید دو چار ہی اور نکلیں گے۔ مولانا آزردہ جو مرزا کی طرز کو نام رکھتے تھے وہ بھی اس شعر کے انداز بیان پر مٹے ہوئے تھے۔ روزمرہ کی نشست الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے بیان کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں نہایت تعریف کے قابل ہیں۔"

غالب کا ڈرامائی شعور بہت زیادہ بلند اور پختہ تھا۔ انھوں نے اس شعر کے علاوہ بہت سے اشعار ایسے کہے ہیں جن میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مصداق شعر کے انتہائی مختصر الفاظ میں انھوں نے ایک چھوٹا سا ڈراما پیش کر دیا ہے۔ مثلاً :-

ع کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد!

ع میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی!
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں!

ع تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

سہ بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ

ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانو وغیرہ وغیرہ

شعر زیر بحث حسنِ بیان کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس میں کتنی معمولی اور پیش پا افتادہ بات کہی ہے، لیکن اس انداز سے کہی ہے کہ ذوقِ سلیم وجد کرنے لگتا ہے اور شاعر کی قادرالکلامی پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔ اشاروں ہی اشاروں سے انتہائی قلیل الفاظ میں بڑی چابک دستی سے ایک کافی طویل مضمون کو پیش کر دیا گیا ہے جیسے کم سے کم لکیروں سے کوئی بہت خوبصورت تصویر بنا دی جائے جس سے بیک وقت عاشق کی صورت حال مضحکہ خیز بھی نظر آتی ہے اور قابلِ رحم بھی۔

عاشق دیدارِ معشوق کی تمنا میں اُس کے گھر پر پہونچتا ہے تو دروازے پر دربان کو مسلط پاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف خاموشی سے بیٹھ جاتا ہے۔ عاشق کا حلیہ ایسا ہے کہ دربان اُس کو کوئی بھک منگا سمجھتا ہے اور اُس کے دروازے کے قریب بیٹھ جانے پر کوئی تعرض نہیں کرتا۔ عاشق اپنی بے تابیِ شوق سے مجبور ہے، لہذا اُسے بیٹھے بیٹھے چین کہاں؟ چنانچہ اس اُمید میں کہ شاید خوشامد کرنے سے دربان اُس کو معشوق کے گھر میں جانے کی اجازت دے دے گا۔ اُٹھ کر اُس کے پیر پکڑ لیتا ہے اُس کی اس حرکت سے دربان پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کوئی بھک منگا نہیں بلکہ عاشق ہے (جن کو بھگانے کے لیے ہی وہ تعینات کیا گیا ہے)

لہذا وہ اس کے ساتھ بڑی سختی سے پیش آتا ہے، اور اُسے بھگا دیتا ہے۔

صرف لفظ "گدا" سے شاعر کا پریشان حال اور افلاس زدہ حلیہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، اور اسی طرح لفظ "شامت" سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دربان نے اس کے ساتھ جو برتاؤ کیا وہ بڑی سختی اور درشتی کا تھا۔ "قدم پاسباں کے لئے" کے ٹکڑے سے عاشق کے اضطراب شوق کی شدت اور اس کے ماتحت وہ کس حد تک اپنے آپ کو ذلیل کر سکتا تھا، ظاہر ہو جاتا ہے۔

نگہ معمارِ حسرت تھا، چہ آبادی چہ ویرانی!!
کہ مژگاں جس طرف وا ہو کفِ دامانِ صحرا ہے

یہ شعر غالبؔ کے غیر متداول کلام کا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ایسے فکر انگیز اشعار ان کے منتخب دیوان میں جگہ پانے سے کیوں رہ گئے۔ اس کی صرف یہی تاویل سمجھ میں آتی ہے کہ جب غالبؔ اپنے کلام کا انتخاب کرنے بیٹھے تو ان کا معتد بہ کلام ان کے سامنے نہیں تھا۔ یا پھر یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کے مذاق شاعری سے مجبور ہو گئے تھے جو عموماً صرف حسن و عشق کی چلتی پھرتی چوٹوں اور چونچلوں ہی کو کمال فن سمجھتا تھا۔ اور غالبؔ کو اپنے بہت سے شہ پارے محض ناقدر شناسی کے خوف سے قلم زد کر دینا پڑے تھے۔

شاعر کہتا ہے کہ میری نگاہ ہر طرف حسرتیں پیدا کرتی رہتی ہے۔ چنانچہ خواہ آبادی ہو خواہ ویرانہ میں جس طرف بھی پلک اٹھا کر دیکھتا ہوں مجھے صحرا کا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے۔

انسان کی مایوسیاں اور مسرتیں بیشتر داخلی اسباب کا (نہ کہ خارجی اسباب کا) نتیجہ ہوتی ہیں۔ ایک دل شکستہ انسان دنیا کی ہر چیز کو غم انگیز پاتا ہے۔ قصور دنیا کا نہیں قصور اپنی ذہنیت کا ہے۔ جو حسرتناک باتوں کا تو ذکر ہی کیا مسرت خیز باتوں میں بھی رنج و الم ہی کا مظاہرہ دیکھتی ہے۔

شاعر نے خوب کہا ہے کہ ویرانی کیا ہے؟ آبادی کو بھی جب میں اپنی حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہوں تو مجھے وہ صحرا کا ایک ٹکڑا دکھائی پڑتی ہے۔

نگاہ کو معمارِ حسرت کہہ کر شاعر نے ایک بہت وسیع اور دقیق مضمون کا بڑی چابک دستی سے احاطہ کر لیا ہے۔

اسی نوعیت کا ایک اور شعر کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔

۵ بغرازِ گاہ صحبتِ غنچہ بہار دکو تماشا
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی

یہاں بھی نگاہ کو سیہ پوش کہہ کر بہار اور تماشے سے لطف اندوز نہ ہوسکنے کا سبب اسی کو قرار دیا ہے۔

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پُرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

یہ شعر غیر متداول کلام کا ہے۔ دنیا کے مصائب اور اس کی لذات کے بے حقیقت ہونے کی بڑی لاجواب تصویر کھینچی ہے۔

دنیا کی زندگی کو دام گاہِ عجز یعنی افتادگی اور بے چارگی کی مکین گاہ کہا ہے۔ انسان جس طور سے جبر مشیت کا شکار رہتا ہے، اور پنجۂ قدرت میں اس کی حیثیت جس طرح ایک طائر اسیر کی سی ہوتی ہے اس کی بڑی دل نشیں تمثیل پیش کی گئی ہے۔

پُرفشانی سے مراد انسان کی وہ کوششیں ہیں جو وہ دولت و شہرت یا آرام و آسائش کے لئے کیا کرتا ہے۔

خاطرِ آسودہ سے مقصود وہ چھوٹی اور محدود طبیعت ہے، جو پست ہمت یا اصل حقیقت سے بے بہرہ ہونے کے باعث ذرا ذرا سی باتوں پر خوش ہو جا کرے اور انھیں کو غنیمت سمجھ لیا کرے جس میں کوئی اضطراب تجسس یا اُمنگ نہ ہو۔ اس سلسلے میں غالب کے غیر متداول کلام کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو۔

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسد
پیچ و تاب دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

شعر زیر بحث میں شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا افتادگی اور بے چارگی کا

ایک جال ہے، اس میں سامانِ آسائش یا آرام اور سکون کی تلاش بالکل لاحاصل ہے۔ جو لوگ جبریت کا شکار ہوتے ہوئے بھی یہاں دولت اور شہرت وغیرہ کے حصول کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں اور اسی کو منتہائے زندگی سمجھتے ہیں وہ صرف خود فریبی میں مبتلا ہیں۔

پیدائش سے موت تک انسان کو قضا و قدر کا تابع فرمان رہنا پڑتا ہے۔ قانونِ قدرت سے سرِ مُو تجاوز کرنے کا اُسے بالکل اختیار نہیں ہے۔ وہ محض ایک بندۂ مجبور ہے۔ ایسی صورت میں اُس کی زندگی کے لئے ہما ہمی نہ صرف بے کار اور بے سود ہے بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ زندگی خود ہی ایک بے چارگی ہے۔ اس میں بہت کچھ کر سکنے کا امکان ہی نہیں ہے، اور اگر بڑی کاوش اور عرق ریزی کے بعد کچھ کر بھی لیا گیا تو نتیجہ کیا؟ موت سب پر پانی پھیر دیتی ہے۔

شوپنہار، نطشے، ہابس، روسو، اور انیسویں صدی کے بہت سے فلاسفروں کا یہی عقیدہ تھا۔

غالب نے اپنے کئی اشعار میں خود زندگی ہی کو موجب آلام بتایا ہے۔ ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
مرنے سے پہلے آدمی، غم سے نجات پائے کیوں

موضوع کچھ مختلف ہے لیکن یہ شعر بھی بڑا فکر انگیز ہے جس میں

خودزندگی کو اُس کے بے حقیقت ہونے کے ثبوت کے طور پر پیش کیا ہے ؎

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

مطلب یہ کہ میرا وجود کسی چیز کا معلول یا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اپنے عدم پر خود ایک دلیل ہے۔ میری زندگی سے صرف میری شکست کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

دو شعر اور ملاحظہ ہوں:۔

؎ غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

؎ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولےٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

طاؤس خاک حسنِ نظر باز ہے مجھے
ہر ذرّہ چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے

یہ بے پناہ شعر غالب کے غیر متداول کلام کا ہے۔ ندرتِ تخیل، حسنِ کلام اور لطفِ بیان کا ایسا دل آویز مرقع بایدوشاید دیکھنے میں آتا ہے۔ اور بلا شبہہ اس قسم کے اشعار کو دنیا کے شاعری کے نادرات میں کہا جا سکتا ہے۔

خاک کے ذروں پر جب روشنی پڑتی ہے تو وہ مختلف رنگوں کے نظر آتے ہیں۔ اس رعایت سے شاعر نے خاک کو طاؤس کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ زمین پر جو رنگ برنگ پھول، پودے یا دوسری چیزیں دکھائی پڑتی ہیں اُن کی برعایت سے بھی اُسے طاؤس خاک کہہ سکتے ہیں۔

حسنِ نظر باز سے مراد ایسا چُلبلا معشوق جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کرے۔ چشمک کے معنی اشارہ ہیں۔ ذروں پر جب روشنی پڑتی ہے تو ان میں ایک خاص تڑپ پیدا ہوتی ہے، اُسے نظر باز کہنا اپنا جواب نہیں رکھتا۔

شاعر کہتا ہے کہ مجھے یہ (طاؤس خاک) خوبصورت، رنگ برنگی زمین ایک ایسا معشوق معلوم ہوتی ہے جو نظر بازی کر رہا ہو کیونکہ اس کا ہر ذرہ مجھے نگاہ ناز کا ایک اشارا دکھائی پڑتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس

دلفریب دنیا کے ذرّے ذرّے میں میرے لئے قدرت کا کوئی نہ کوئی پیغام مضمر ہے اور جو میرے زندگی کے ذوق و شوق پر تازیانے کا کام کر رہا ہے۔

شاعر نے ایک انتہائی لطیف مضمون کو بڑے اچھوتے اسلوب سے ادا کیا ہے۔ طاؤسِ خاک، حسنِ نظر باز، چشمکِ نگہ ناز، بڑے معنی خیز اور دل میں کھپ جانے والے الفاظ ہیں جن پر ذوقِ سلیم وجد کرتا ہے، اور شاعر کے حسنِ انتخاب پر سر دُھنتا ہے۔

وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراجِ تمنا کے لئے درکار ہے

یہ شعر بھی غیر متداول کلام کا ہے۔ عجیب و غریب شعر کہا ہے۔ شاعر کی نفسیاتی باریک بینی اور موشگافی کی بے ساختہ داد دینا پڑتی ہے۔ اسی قسم کے اشعار کی بنا پر بالکل صحیح کہا گیا ہے کہ غالب کم سے کم اردو زبان میں وہ پہلا شاعر ہے جس نے غزل کو حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ اور محض خیالات اور جذبات کا ترجمان بنانے کے علاوہ فلسفیانہ نکتہ سنجیوں کا بھی آلۂ کار بنایا۔

اس شعر کے سیدھے سادے معنی تو یہ ہوئے کہ شاعر کہتا ہے کہ مجھے وصل بھی نصیب ہوا (جو عام طور سے عشاق کی معراج یا حاصل زندگی سمجھا جاتا ہے) تب بھی میرے دل کو اطمینان ہونے کے بجائے ایک عجیب قسم کا انتظار ہے۔ غالباً یہ انتظار کسی ایسی نئی مصیبت کا ہے جو (ایک دفعہ پھر) میری تمناؤں کو خاک میں ملا دے گا۔

بادی النظر میں اس مطلب سے کوئی خاص نتیجہ اخذ نہیں ہوتا جب تک کہ یہ پیش نظر نہ رکھا جائے کہ شاعر ایک ایسے شخص کی واردات قلب بیان کر رہا ہے جو مصیبتوں کا عادی ہو چکا ہے اور جسے اپنی زندگی کے ہر گوشے میں صرف تاریکی نظر آتی ہے۔

طمانیت قلب کے لئے صرف حصول مقصد کافی نہیں ہے۔ اطمینان

اور بے اطمینانی کی کیفیات انسان کے اندازِ فکر اور زاویۂ نگاہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ عاشق کو اس کا معشوق مل گیا تو دنیا یہ سمجھنے لگی کہ اب اس کو جو کچھ وہ چاہتا مل گیا ہے، لہٰذا اب اس سے بڑھ کر خوش قسمت انسان اور کون ہو سکتا ہے۔ لیکن عاشق خود اپنی یہ کیفیت بیان کرتا ہے کہ مجھے وصل میں بھی چین نہیں مل سکا۔ میرا دل اتنی بڑی نعمت حاصل کر کے بھی اپنی فطرت کے ہاتھوں پہلے ہی کی طرح مضطرب اور پریشان ہے اور کسی ایسی نئی مصیبت کا متمنی ہے جو اس کی بھری چنگی تمناؤں کو پھر سے پامال کر ڈالے۔ تکالیف اور مصائب اٹھاتے اٹھاتے انسان اذیت پسند ہو جاتا ہے۔ اتفاقِ روزگار سے اگر اسے کوئی خوشی نصیب بھی ہو جاتی ہے تو وہ اس سے بہرہ مند ہونے کے بجائے اس میں بھی کوئی رنج کا پہلو تلاش کرنے لگتا ہے۔ رنج و الم اس کی زندگی کا ایسا اوڑھنا بچھونا بن جاتے ہیں کہ اُن کے بغیر وہ زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے غم
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

خوشی اور ناخوشی کو اندازِ فکر اور زاویۂ نگاہ کا مرہونِ منت بتاتے ہوئے غیر متداول کلام کا ایک اور شعر ہے۔ ؎

شورِ نیرنگِ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ
ہم خوشی اکثر رہینِ ناخوشی کرتے رہے

اس قسم کے اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ پیچیدہ نفسیاتی مسائل پر غالب کی دسترس کتنی ہمہ گیر تھی۔ اُن کے زمانے میں غزل کا جو مزاج اور خمیر تھا وہ ایسے مسائل کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ عام لوگ اُن کو سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے ان کا مذاق اُڑاتے اور مجبوراً غالب کو بھی اپنے خون جگر سے بنائے ہوئے ان نقوش کو قلم زد کر دینا پڑا تھا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ غالب اس سلسلے میں بڑے ناشکرگزار تھے کہ انھوں نے بڑی سے بڑی قدردانی کے باوجود اپنی ناقدردانی کا رونا رویا ہے، وہ شاید نہیں سمجھتے کہ اُن کی بنیادی شکایت یہ تھی اور بالکل بجا تھی کہ لوگ ان کے کلام کو اس معیار سے نہ دیکھتے اور نہ پرکھتے جس کا کہ وہ مستحق تھا۔ وہ اپنے آپ سے یہ کہنے پر مجبور تھے۔ ؎

پرواز تپش رنگے، گلزار ہمہ تنگے!
خوں ہو تفسِ دل میں، اے ذوقِ پرافشانی

گدائے طاقت تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

غالب کے غیر متداول کلام میں جسے اکثر ان کا قلم زدہ کلام کہا جاتا ہے، یہ ایک غزل مسلسل کا مطلع اول ہے۔ پوری غزل کا تخاطب خدا سے ہے۔ اس میں حمد اور دعا کے ساتھ ہی شکوے اور طنز کی بڑی فکر انگیز آمیزش ہے۔ ایک حیثیت سے اسے علامہ اقبال کے "شکوہ" کا پیش رو کہا جا سکتا ہے۔ اس غزل کی تصنیف کے وقت غالب کی عمر مشکل سے چوبیس سال کی تھی۔

شاعر کہتا ہے کہ زبان اپنی طاقت گویائی کی بھیک تجھی سے مانگتی ہے۔ (کیونکہ) خاموشی کو بیان کا پیرایہ تو ہی عطا کرتا ہے یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ تیرے حضور خاموشی بھی بیان کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی زبان پر حرف مطلب نہ بھی آئے تب بھی تو اس کو سمجھ لیتا ہے۔ تو دل کی بات بھی جانتا ہے۔

فسردگی میں ہے فریاد بے دلاں تجھ سے
چراغ صبح و گل موسم خزاں تجھ سے

افسردگی کے عالم میں افسردہ دل تجھی سے فریاد کرتے ہیں کیونکہ چراغ صبح کی بے نوری اور گل خزاں کی پژمردگی کا تو ہی ذمہ دار ہے۔ شعر میں ایک قسم کا طنز سا محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ تو ہی ظلمتوں اور مایوسیوں کو خلق کرتا ہے، لہذا ان کے متعلق یاس و حسرت کے عالم میں شکستہ دل لوگ تجھی سے فریاد کرنے پر مجبور ہیں۔
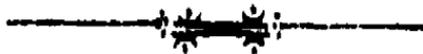
پری بشیشہ و عکس رُخ اندر آئینہ
نگاہ حیرت مشاطہ، خوں فشاں تجھ سے

پری خود شیشے میں پوشیدہ ہے، لیکن اس کے رُخ کا عکس آئینے میں دکھائی دے رہا ہے۔ مطلب یہ کہ معشوق حقیقی (باری تعالےٰ) خود تو نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اُس کی ذات گرامی کا پرتو ہم کائنات کی ہر چیز میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ عجیب و غریب تماشا دیکھ کر اہل دل یا صاحب نظر کی حیرت زدہ آنکھوں سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔

بہت خوب، اور بڑے انوکھے انداز سے کہا ہے۔

پری، حسین یا معشوق کو کہتے ہیں۔ پری کی رعایت سے شیشہ کہا ہے جس سے حجاب قدس مُراد ہے۔ عکس رُخ سے ذات گرامی کا پرتو یا اُس کی قدرت کی کارفرمائیاں مقصود ہیں۔ آئینہ کائنات کو کہا ہے اور لاجواب کہا ہے۔ ساری کائنات معشوق حقیقی کی جلوہ سامانیوں سے سرشار ہے اور انسان اس آئینے میں اُس کو نہیں صرف اُس کا عکس رُخ دیکھتا ہے۔ یہ کام صرف آئینہ ہی کر سکتا ہے کہ کوئی اس میں اپنی صورت دیکھے اور ہم اس کوئی کو براہ راست دیکھے بغیر صرف اس کا عکس آئینہ میں دیکھیں۔

پری، شیشہ، عکس رُخ، اور آئینہ کے خیال سے مشاطہ کہا ہے

جس کا کام آرائش کرنا اور سنوارنا ہوتا ہے۔ یہاں اس سے اہل دل یا صاحب نظر مراد ہے۔ جو ذات گرامی کے حسن کا پرتو، تو ایک ایک شے میں دیکھتا ہے لیکن خود اسے کہیں بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور یہ بات انتہائی حیرت کا موجب ہے۔

حاشیہ:

"دوسرے مصرعہ کا مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ مشاطہ جو طرح طرح کی آرائش سے معشوق کا حسن بڑھاتی ہے اس کے حسن کو دیکھ کر حیرت میں غرق ہے۔ یعنی وہ حسن از خود ایسا ہے کہ مشاطگی اس کو دیکھ کر محو حیرت ہے۔"

عرشی

بہارِ حیرت نظارہ سخت جانی ہے
حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں تجھ سے

بہارِ حیرت نظارہ (نظارہ کی حیرت کی بہار) سے مراد حیرت انگیز منظر کا نقطۂ عروج یا ایک انتہائی دل چسپ تماشا ہے۔ سخت جانی سے مقصود عالمِ نزع کی تکلیف انسان کا مر مر کر جینا، مصائب اور پریشانیوں کے درمیان زندگی کے لئے جد و جہد کرنا ہے۔

انسان کن تکلیفوں اور صعوبتوں کے درمیان زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے، یہ ایک انتہائی حیرت انگیز اور دل چسپ تماشا ہے حالانکہ مرنا ایک امرِ لازمی ہے اور مرنے والوں کا خون اجل کے پاؤں کی حنا کا کام کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ تو نے پہلے ہی سے مقدر کر چکا ہے کہ انسان اپنی جان سے جائے اور اس سے موت کے حسن (یا دبدبے) میں اضافہ ہوتا رہے۔

حاشیہ:۔ "میری دانست میں اس شعر میں زندگی اور موت کی کشمکش کا بیان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کی وہ کشمکش جو موت سے مقابلہ کرنے میں پیش آرہی ہے وہ قابلِ داد ہے کہ وہ کسی طرح موت کے چنگل میں آنے کو آمادہ نہیں اور باوجودیکہ تیرے حکم سے یا تیرے بنائے ہوئے آئین کے مطابق زندگی کا خون پائے اجل کی حنا بنتی رہتی ہے لیکن زندگی دوسری نئی نئی شکلیں اختیار کر کے نمودار ہوتی رہتی ہے۔" قریشی

طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سُو
بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے

نالے اور فغاں میں تو اثر کا جادو پیدا کرکے اُسے جس قدر موجب تسکین بناتا ہے وہ تو ایک طرف رہا۔ نالے کی بہار اور فغاں کی رنگینی جیسی نعمتیں بھی تو تیری دین ہیں۔

اپنی نوعیت کا لاجواب شعر کہا ہے۔ مطلب یہ کہ نالے اور فغاں میں تو جو اثر پیدا کرتا ہے یا اُنھیں شرف قبولیت بخش کر جس طور سے دادخواہ کی دل دہی کر دیتا ہے وہ تو ایک علیحدہ بات ہے۔ اُس سے قطع نظر اُن سے جو لطف اور انبساط حاصل ہوتا ہے وہ بھی تیری ایک خاص عنایت اور بخشش ہے۔

حاشیہ :-

"مطلب یہ ہے کہ نالۂ نیم شبی یا دعائے سحری میں اثر پیدا ہو یا نہ ہو ہم تو اُسی کے شکر گزار رہیں کہ تو نے ہمارے لیے (یعنی اہل دل کے لیے) نالے کو پُر لطف بنا دیا ہے کہ ہمیں اُسی میں وہ لطف آتا ہے کہ بس کہہ نہیں سکتے۔"

مرتب

چمن چمن گلِ آئینہ در کنار ہوس
امید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

بڑے طنز سے شاعر کہتا ہے کہ تو نے ہوس (اہل ہوس) کے آغوش میں تو چمن در چمن بھر دیے ہیں، لیکن جو لوگ تیرا آسرا لگائے بیٹھے ہیں، ابھی تک صرف گلستاں کے تماشے ہی میں محو ہیں، ان کے حصے میں سوائے اس کے کچھ نہیں آیا ہے کہ وہ گلستاں کو حسرت سے دیکھتے رہیں۔ سہ

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا (اقبال)
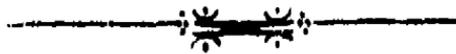
نیاز پردۂ اظہار خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے

نیاز یعنی عبادت صرف اظہار خود پرستی کا ایک بہانہ ہے (تیرا، جو عبادت کا طلبگار ہے؟ یا میرا، جو عبادت کرتا ہے؟) جب سجدہ کرنے والی جبیں بھی تیری اور آستاں بھی تیرا تو کون کس کی عبادت کرے؟ اور کیوں؟۔

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں (غالب)

عبدالباری آسی صاحب نے اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے "اصل یہ ہے کہ تیرے سوا کوئی موجود نہیں، جو کچھ کہ ہے تو ہے جو کچھ کہ ہے تجھ سے ہے۔ ہم نے جس کا نام نیاز رکھا ہے وہ در اصل ایک پردہ ہے جس کی آڑ میں خود پرستی کی جاتی ہے، یعنی کہتے ہیں کہ ہمارا نیاز، ہم نے نیاز کیا، تو یہی ہم کے لفظ کی شرکت ایک قسم کی خود پرستی ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ سب باتیں ہیں نہ کوئی چیز عجز ہے نہ نیاز ہے۔ جبین تیری، سجدہ فشانی تیری، آستاں تیرا۔ ہائے کیا خوب کہا ہے۔ ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا "

حاشیہ:۔ "یہ شعر وحدۃ الوجود کے مسئلے سے متعلق ہے یعنی جب عابد اور معبود سب ایک ہیں تو پھر نیاز یا عبادت خود پرستی نہیں تو اور کیا ہے؟" عرشی

بہانہ جوئے رحمت، کمیں گرِ تقریب
وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

تیری رحمت اپنی کارفرمائی کے لئے موقع اور محل کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہے۔ ایک طرف تو ہی انسانوں کو اپنی من مانی کر گزرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور دوسری طرف تو ہی ان کے اعمال کا محاسبہ بھی کرتا ہے اور انھیں طرح طرح کی آزمائشوں میں بھی ڈالتا ہے۔

مطلب یہ کہ تو ہی اپنے بندوں کو گناہ کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ پھر تو ہی ان گناہوں کا احتساب بھی کرتا ہے اور اس طرح تجھے اپنی رحمت کی فیاضیاں دکھانے کا موقع مل جاتا ہے۔

حاشیہ ۱ :-

"تو ہی اپنے بندوں کو اپنی ذات ذوالاصفات سے محبت کرنے کا حوصلہ عطا کرتا ہے اور تو ہی دوسری طرف ان کا امتحان بھی لیتا ہے۔ اگر تو اپنی رحمت سے ان کو یہ حوصلہ عطا نہ کرتا تو پھر ناممکن تھا کہ وہ تیرے ہر امتحان میں پورے اُتر سکتے" عرشی

۱۸۹

اسدؔ بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

بہار کا موسم ہے اور اسدؔ قفس کے گوشے میں قید پڑا ہے۔ تجھی نے طاقتِ خرام عطا کی، تجھی نے صبا بنائی، تجھی نے گلستاں بنایا۔ ایک اسیرِ غم کے لیے ان کا کیا مصرف ہے؟ تو اُسے بھی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی توفیق عطا کر دے تو تیرے لیے کون سی بڑی بات ہے۔ شاعر کی التجا بڑی دردناک اور موثر ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

مندرجہ عنوان شعر متداول دیوان میں تنہا درج ہے۔ جیسا کہ امتیاز علی عرشی صاحب نے تحریر فرمایا ہے، ابھی حال میں وحید الدین نظامی بدایونی صاحب کے مملوکہ مخطوطے میں اس کے ساتھ کے دو اشعار اور بھی دستیاب ہوئے ہیں جن سے اس کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے

اُس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اُٹھا رکھتے تھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب
کا
غیر متداول کلام
(مختصر انتخاب)

انتخاب از نسخۂ حمیدیہ

(۱)

تغافل بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی سے
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی
برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

تنگی رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا
میرا سفر، بہ طالعِ چشمِ حسود تھا

خورشبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ
سر تا قدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب؟
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اُس کا
صبح موجۂ گل کو نقشِ بوریا پایا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک — شوقِ دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا
شوقِ رسوائیِ دل دیکھ کہ اے نالۂ شوق — لاکھ پردے میں چھپا پر وہی عریاں نکلا
شوخیِ رنگِ حنا خونِ وفا سے کب تک؟ — آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کے بخشا جاوے مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

واں ہجومِ نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

جوشِ تکلیفِ تماشا، محشرستانِ نگاہ
فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا

بے خبر مت کہہ ہمیں، بے درد، خود بینی سے پوچھ
قلزمِ ذوقِ نظر میں آئنہ پایاب تھا

بے دلیہائے اسدؔ، افسردگی آہنگ تر
یاد ایامے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا

اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بے تابی
نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

اسدؔ وحشت پرستِ گوشۂ تنہائی دل ہوں
برنگِ موجِ مے خمیازۂ ساغر ہے رم میرا

اسدؔ یہ عجز و بے سامانیٔ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے، دعوے ہے خدائی کا

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع
شعلۂ عشق کو اپنا سروساماں سمجھا

کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا
ہر برگِ گل کے پردے میں دل بے قرار تھا

سراپا یک آئینہ دارِ شکستن　　ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا
بصورت تکلف بہ معنی تاسف　　اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

اے وائے غفلتِ نگہِ شوق ورنہ یاں
ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر
پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا
ہر رنگ میں جلا اسدِؔ فتنہ انتظار
پروانۂ تجلّیِ شمعِ ظہور تھا

بہارِ رنگِ خونِ گل ہے ساماں اشکباری کا
جنونِ برق نشتر ہے رگِ ابرِ بہاری کا
اسدؔ ساغر کشِ تسلیم ہو، گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا
یارب، نفس، غبار ہے کس جلوہ گاہ کا
عزلت گزینِ بزم ہیں، وا ماندگانِ دید
مینائے مے ہے، آبلہ پائے نگاہ کا
جیبِ نیازِ عشق، نشاں دارِ ناز ہے
آئینہ ہوں شکستنِ طرفِ کلاہ کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا
بے کسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہیں
یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا

ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا

اے آہ، میری خاطرِ وابستہ کے سوا
دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا
موجِ خمیازہ سے ہے زخم نمایاں میرا

اسدؔ خاکِ درِ مے خانہ اب سر پر اڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے کا تا بہ زانو تھا

عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے بہ نوکِ نیشِ عقرب ہا

بہ رہنِ شرم ہے با وصفِ شہرت اہتمام اُس کا
نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اُس کا

بہ امیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت
مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اُس کا

اسدؔ سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اس کا ابرِ بے پروا خرام اُس کا

آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

شب کہ تھی کیفیتِ محفل بیادِ روئے یار
ہر نظر داغ سے خالِ لبِ پیمانہ تھا

دیکھ اُس کے ساعدِ سیمیں و دستِ پُرنگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمعِ گل پروانہ تھا

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

شب تری تاثیرِ سحرِ شعلۂ آواز سے
تارِ شمع آہنگِ مضرابِ پرِ پروانہ تھا

موسمِ گل میں مے گلگوں حلال مے کشاں
عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا
آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

دیوانگی اسد کی حسرت کش طرب ہے
در سر ہوائے گلشن دل میں غبارِ صحرا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے
رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا

اسد اے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

اسدارباب فطرت قدردانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

محتسب سے تنگ ہے ازبسکہ کار مے کشاں
رز میں جو انگور نکلا عقدۂ مشکل ہوا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسد
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

ہے تنگ زواماندہ شدن حوصلۂ پا
جو اشک گرا خاک میں ہے آبلۂ پا

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر اے اسد
نقشِ پائے خضر یاں سدِّ سکندر ہو گیا

عروجِ ناامیدی، چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے
بہارِ بے خزاں ازآہِ بے تاثیر ہے پیدا

نہ پوچھ حال شب و روز ہجر کا
خیال زلف و رخ دوست صبح و شام رہا

بسنگِ شیشہ توڑوں ساقیا پیمانۂ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

(ب)

شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا اے اسد
گر گیا بامِ فلک سے صبح طشتِ ماہتاب

عمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کار اسد
اے شبِ پروانہ و روزِ وصالِ عندلیب

(ت)

نہ اوروں کی سنتا نہ کہتا ہوں اپنی — سرِ خستہ و شورِ وحشت سلامت!
نہ فکرِ سلامت نہ بیمِ ملامت — ز خود رفتگیہائے حیرت سلامت!

رہے غالبِ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

(ث)

ناخنِ دخلِ عزیزاں، یک قلم ہے نقب زن
پاسبانی طلسمِ گنجِ تنہائی عبث

محملِ پیمانۂ فرصت ہے بر دوشِ حباب
دعوئے دریا کشی و نشہ پیمائی عبث

اے اسد بے جا ہے نازِ سجدۂ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعوئے آرائی عبث

(ج)

ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار
نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج

تا صبح ہے بہ منزلِ مقصد رسیدنی
دودِ چراغِ خانہ غبارِ سفر ہے آج
سیرِ ملکِ حسن کر میخانہ ہا نذرِ خمار
چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا پہ باج

(پ)

خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ
کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا
سامانِ دعا وحشت و تاثیرِ دعا ہیچ

(ح)

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسدؔ
غفلت آرامی یاراں پہ ہے خنداں گل و صبح

(د)

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں؟ ورنہ
برنگِ نے ہے نہاں در استخواں فریاد
جواب سنگ دلیہائے دشمناں ہمت
ز دستِ شیشہ دلیہائے دوستاں فریاد
ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے اے شاہِ بے کساں فریاد

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد

تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ
متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

ہم نے سو زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد

بسکہ ہیں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام
آستر ہے خرقۂ زہاد کا صوفِ مداد

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند
اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند

موقوف کیجیے یہ تکلف نگاریاں
ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ
بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند؟

بزمِ داغِ طرب و باغِ کشادِ پرِ رنگ
شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند؟

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام
مشکل آساں کن یک خلق، تغافل تا چند؟

(س)

مدعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل
ہے تماشا ردیوں کا عتاب آئینے پر

لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی
ہوئی قطرہ فشانیہائے مے بارانِ سنگ آخر

اے چرخ خاک بر سر تعمیر کائنات لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر
آئینہ داغ حیرت و حیرت شکنج یاس سیماب بیقرار و اسد بیقرار تر!

اسد کی طرح میری بھی، بغیر از صبح رخساراں
ہوئی شام جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

ظلم کرنا گدائے عاشق پر نہیں شاہانِ حسن کا دستور
دوستو مجھ ستم رسیدہ سے دشمنی ہے وصال کا مذکور
زندگانی پہ اعتماد غلط ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

(ز)

فریب صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ
نگاہ عکس فروش و خیال آئنہ ساز

ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبا ہے آبگینہ گداز

آئی یک عمر سے معذورِ تماشا نرگس
چشمِ شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز

حسن خود آرا کو ہے مشقِ تغافل ہنوز
ہے کفِ مشاطہ میں آئینۂ گل ہنوز

چاکِ گریباں کو ہے ربطِ تامل ہنوز
غنچے میں دل تنگ ہے جو صدا گل ہنوز

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

(س)

اے اسد ہم خود اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

حیرت سے ترے جلوے کی ازبسکہ ہیں بیکار
خور قطرۂ شبنم میں ہے جوں شمع بفانوس

(غ)

ہوتے ہیں محوِ جلوۂ خور سے ستارگاں
دیکھ اُس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

کون آیا جو چمن بے تابِ استقبال ہے
جنبشِ موجِ صبا ہے شوخیِ رفتارِ باغ

آتشِ رنگِ رُخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیِ بازارِ باغ

(ف)

جنبش از نفس، بتاں کے کرم نے وفا نہ کی
تھا محملِ نگاہ بدوشِ شرار حیف

خرمن بباد دادہٗ دعوے ہیں، ہو سو ہو
ہم یک طرف ہیں برق شرر بیز یک طرف

یک جانب اے اسد شبِ فرقت کا بیم ہے
دام ہوس ہے زلف، دل آویز یک طرف

(گ)

اے آرزو شہیدِ وفا، خوں بہا نہ مانگ
جز بہر دست و بازوے قاتل دعا نہ مانگ

برہم ہے بزمِ غنچہ بیک جنبش نشاط
کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل ہوا نہ مانگ

میں دور گردِ عرض رسوم نیاز ہوں
دشمن سمجھ، وے نگہِ آشنا نہ مانگ

(ل)

نور سے تیرے ہے اُس کی روشنی
ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

ناسازیِ نصیب، درشتیِ غم سے ہے
الحمید نا اُمید و تمنا شکستہ دل ہے

ہے سنگِ ظلم چرخ سے میخانے میں اسد
صہبا فتادہ خاطرِ مینا شکستہ دل

بیکسی افسردہ ہوں، اے ناتوانی کیا کروں
جلوۂ خورشید سے ہے گرم پہلوئے ہلال

شکوہ دردو دردِ داغ اے بے وفا معذور رکھ
خوں بہائے یک جہاں اُمید ہے تیرا خیال

دیوانگاں کا چارہ فروغِ بہار ہے
ہے شاخِ گل میں پنجۂ خوباں بجائے گل

مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں
اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

(م)

تکلف آئنۂ دو جہاں مدارا ہے
سُراغ یک نگہِ قہر آشنا معلوم

اسد فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
دگرنہ دلبری وعدۂ وفا معلوم

بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے
چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم

از انجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم
رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم

رسیدن گلِ باغِ واماندگی ہے
عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم
نہ ذوقِ گریباں نہ پروائے داماں نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم
اسد شکوہ کفر و دعا ناسپاسی ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم

اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی ؟
یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام

(ن)

جائے کہ پائے سیل درمیاں نہیں
دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں
گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے
اے آگہی فریبِ تماشا کہاں نہیں
جنبشِ دل سے ہوئے ہیں عقدہ ہائے کار وا
کم تریں مزدورِ سنگیں دستِ فرہادیاں
ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں
ہے زرِ گل بھی نظر میں جوہرِ فولادیاں
قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں اسد
ہے تماشا کردنی گل چینیٔ جلادیاں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

کیفیت دیگر ہے فشارِ دلِ خونیں
اک غنچے سے صد ساغرِ گل رنگ نکالوں

میں چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

پیدا نہیں ہے اصل تگ و تاز جستجو
مانندِ موجِ آب زبان بریدہ ہوں

میں بے ہنر کہ جوہر آئینہ تھا عبث
پائے نگاہِ خلق میں خار خلیدہ ہوں

ہوں گرمیِ نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں

بوحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے
مہ و خورشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں

سایۂ گل داغ و جوشِ نکہت گل موجِ دود
رنگ کی گرمی سے ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

ہے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
ایک طرف جلتا ہے دل اور ایک طرف جلتا ہوں میں

چمن، نامحرمِ آگاہیِ دیدار خوباں ہے
سحر گلہائے نرگس چند چشم کور ملتے ہیں

ہے دماغی، حیلہ جوئے ترک تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس زنجیر رسوائی نہیں

کس کو دوں یارب حسابِ سوزنا کیہائے دل
آمد و رفتِ نفس، جز شعلہ پیمائی نہیں

ہے طلسمِ دہر میں صد حشرِ پاداشِ عمل
آگہی، غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

رنجشِ دل یک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ آزردگاں

خار سے گل سینہ افگارِ جفا ہے اے اسدؔ
برگ ریزی ہے پرافشانیِ ناوک خوردگاں

(۹)

وہ دل، جوں شمع، بہرِ دعوتِ نظارہ لا، یعنی
نگہ لبریزِ اشک و سینہ معمورِ تمنا ہو

نہ دیکھیں روئے یک دل سرد، غیر از شمعِ کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسدؔ گرمِ تماشا ہو!

ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا
اب اس سے ربط کروں جو بہت ستم گر ہو

امیدوار ہوں، تا شیرِ تلخ کامی سے
کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو

زلفِ خیالِ نازک و اظہارِ بے قرار
یا رب، بیانِ شانہ کشِ گفتگو نہ ہو

واں پرفشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صبحِ بہار بھی، قفسِ رنگ و بو نہ ہو

نہیں جز درد، تسکینِ نکوہشِ ہائے بے درداں
کہ موجِ گریہ میں صد خندۂ دنداں نما گم ہو

بلاگردانِ تمکینِ بتاں صد موجۂ گوہر
عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو

اٹھاوے کب وہ جانِ شرم تہمت قتلِ عاشق کی
کہ جس کے ہاتھ میں مانندِ خوں رنگِ حنا گم ہو

(۵)

ہر داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے
عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بہ سوزِ دل
دردِ جدائیِ اسدؔ اللہ خاں نہ پوچھ

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

بسکہ مے پیتے ہیں اربابِ فنا پوشیدہ
خطِ پیمانۂ مے، ہے نفسِ دزدیدہ

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و اُمید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ

گاہ بہ خلد اُمید وار، گہ بہ جحیم بیم ناک
گرچہ خدا کی یاد ہے، کلفت ما سوا سمجھ

اے بہ سرابِ حُسنِ خلق، تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر، ناز کو التجا سمجھ

شوخیِ حُسن و عشق ہے آئینہ دارِ ہم دگر
خار کو بے نیامِ جان، ہم کو برہنہ پا سمجھ

نے سرو برگ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو، ہم کو بھی آشنا سمجھ

(ی)

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اُٹھایئے

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے
کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی؟
سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی!

صد رنگ گُل کترنا، در پردہ قتل کرنا
تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی

ہر چند عمر گزری آزردگی میں، لیکن
ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی

ہے یاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت
دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

نظر بہ نقصِ گدایاں، کمالِ بے ادبی ہے
کہ خارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے

ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ
لبِ قدح پہ کفِ بادہ، جوشِ تشنہ لبی ہے

چمن میں کس کی یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا؟
کہ برگ برگِ سمن شیشہ ریزۂ حلبی ہے

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار
یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے

تا چند پستیِ نظرِ طبعِ آرزو؟
یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے
اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے

کہوں کیا گرم جوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی
کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی

بیادِ گرمیِ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالب سوزشیں داغِ نمایاں کی

غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بے باکیِ مستاں
نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی نازِ خود بینی
تکلف برطرف آئینہ تمیز حائل ہے

ہوں گرفتارِ کمیں گاہِ تغافل کہ جہاں
خوابِ صیاد سے پرواز گرانی مانگے

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے

سرورِ نشۂ گردش، اگر کیفیت افزا ہو
نہاں ہر گردِ باد دشت میں جامِ سفالی ہے

عروجِ نشہ ہے سر تا قدم قدِ چمن رویاں
بجائے خود وگرنہ سرو بھی مینائے خالی ہے

ہوا آئینہ جامِ بادہ عکسِ روئے گلگوں سے
نشانِ خالِ رخ داغِ شرابِ پرتگالی ہے

یہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے
زمیں جوشِ طرب سے، جامِ لبریزِ سفالی ہے

اسد مت رکھ تعجب خردماغیہائے منعم کا
کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

داغ ہم دیگر ہیں اہل باغ گر گل ہو شہید
لالہ چشمِ حسرت آلودِ چراغ کشتہ ہے

ہو جہاں تیرا دماغِ نازِ مستِ بے خودی
خوابِ نازِ گل رُخاں، دودِ چراغ گفتہ ہے

وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور رہوا غالب
صد جلوہ آئینہ یک صبحِ جدائی ہے

حسرت سے دیکھ رہے ہیں ہم آب و رنگِ گل
مانند شبنم، اشک ہیں مژگانِ خار سے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسد
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو، تو دکھلادوں کہ یک عالم گلستاں ہے

کجا مے؟ کو عرق؟ سعیِ عروجِ نشہ رنگیں تر
خطِ رخسارِ ساقی تا خطِ ساغر چراغاں ہے

تکلف سازِ رسوائی ہے غافل، شرمِ رعنائی
دلِ خوں گشتہ در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے

اسد جمعیتِ دل در کنارِ بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل
حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے

ساقی، بہار موسمِ گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

وقت اس افتادہ کا خوش جو قناعت سے اسد
نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

آتش افروزیِ یک شعلۂ ایما تجھ سے
چشمک آرائیٔ صد شہرِ چراغاں مجھ سے

اے سرِ شوریدہ! ذوقِ عشق و پاسِ آبرو
یک طرف سودا و یک سو منتِ دستار ہے

وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراجِ تمنا کے لیے درکار ہے

تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے
نگاہِ نازِ چشمِ یار میں زنارِ مینا ہے

نگہ معمارِ حسرت تھا، چہ آبادی چہ ویرانی
کہ مژگاں جس طرف وا ہو کفِ دامانِ صحرا ہے

ہے بہار تیز رو گلگونِ نکہت پر سوار
یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے

اسد بہار تماشائے گلستانِ حیات

وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے

ہر شکست قیمتِ دل میں صدائے خندہ ہے

عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ

صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسد

دکھلا کے اُس کو آئنہ توڑا کرے کوئی

میں ہوں اور حیرتِ جاوید مگر ذوقِ خیال

بہ فسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے

لطفِ عشقِ ہر یک، انداز دگر دکھلائے گا

بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائے گا

ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے سیرِ گلستاں کر

شرارِ آہ سے موجِ صبا دامانِ گلچیں ہے

پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے

شبِ ماتم تہِ دامانِ دودِ شمع بالیں ہے

بہار باغ پامالِ خرامِ جلوہ فرمایاں

حنا سے دست و خون کشتگاں سے تیغ رنگیں ہے

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے
دامانِ صد کفن تہِ سنگِ مزار ہے

زنجیر یاد پڑتی ہے جادے کو دیکھ کر
اُس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے

برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی
کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو، عندلیب
زخمِ فراق خندۂ بے جا کہیں جسے

یارب، ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو
یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
پُر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے
خدا یعنی پدر سے مہرباں تر پھرے ہم دربدر ناقابلی سے

جنوں افسردہ و جاں ناتواں، اے جلوۂ شوخی کر
گئی یک عمر خود داری باستقبالِ رعنائی

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسد
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

رچ گیا جوشِ صفائے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیہ فامی تری

برگ ریز بہار ہے گل، ہے وضع زر افشاندنی
باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

ہم نشینیِ رقیباں، گرچہ ہے سامانِ رشک
لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری

بُت خانے میں اسد بھی بندہ تھا گاہے گاہے
حضرت چلے حرم کو اب آپ کا خدا ہے

گردش میں لا تجلی، صد ساغرِ تسلی
چشم تحیر آغوش مخمورِ ہر ادا ہے

چاہے گر جنت جز آدم وارث آدم نہیں
شوخیِ ایمانِ زاہد سستیِ تدبیر ہے

موجِ تبسم لب آلودہ مسی میرے لئے تو تیغ سیہ تاب ہو گئی
رخسار یار کی جو کھلی جلوہ گستری زلفِ سیاہ بھی شب مہتاب ہو گئی
غالب زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی

طاؤسِ خاک حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ، چشمک نگہِ ناز ہے مجھے

محیط دہر میں بالیدن، از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے

زبان عرضِ تمنائے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ بر انداز گفتگو جانے

شوخیِ چشمِ حبیب، فتنۂ ایام ہے
قسمتِ بختِ رقیب، گردشِ صد جام ہے

گریۂ طوفاں رکاب نالۂ محشر عناں
بے سر و ساماں اسد فتنہ سرانجام ہے

صبح سے معلوم، آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق
ہر بتِ خورشید طلعت، آفتابِ بام ہے

مستعد قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک
کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

ہو جہاں وہ ساقیِ خورشید رو مجلس فروز
واں اسد تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

برہنِ ضبط ہے آئینہ بندیِ گوہر
وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے

اسد بناز کیِ طبع آرزو انصاف
کہ ایک وہمِ ضعیف اور غمِ دو عالم ہے

کشودِ غنچۂ خاطر عجب نہ رکھ غافل
صبا خرامیِ خوباں بہار ساماں ہے

شفق بدعوے عاشق گواہ رنگیں ہے
کہ ماہ دزدِ حنائے کفِ نگاریں ہے

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پُرفشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش
عافیت سرمایۂ بال دپرِ نہ کشودہ ہے

فصلِ گل میں دیدۂ خونیں نگاہانِ جنوں
دولتِ نظارۂ گل سے شفق سرمایہ ہے

شورشِ باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ آہ
شیونِ دل، یک سرودِ خانۂ ہمسایہ ہے

دامنِ گردوں میں رہ جاتا ہے ہنگامِ وداع
گوہرِ شب تاب، اشکِ دیدۂ خورشید ہے

فرصت، آئینۂ صد رنگ خود آرائی ہے
روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

شمع آسا چہ سرِ دعوے و کو پائے ثبات
گلِ صد شعلہ بہ یک جیبِ شکیبائی ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بے تاب ہو جاوے
پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے

برنگِ گُل اگر، شیرازۂ بندِ بیخودی رہیے
ہزار آشفتگی، مجموعۂ یک خواب ہو جاوے

اسدؔ با وصفِ مشق بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے — جوں شمع دل بخلوتِ جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر — دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے اُس آشنا کے پاس — کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچیے
گر سینے کو نہ دیجیے پروازِ سادگی — جز خطِ عجز، نقشِ تمنا نہ کھینچیے
دیدارِ دوستان لباسی ہے ناگوار — صورت بہ کارخانۂ دیبا نہ کھینچیے
ہے بے خمار نشۂ خونِ جگر اسد — دستِ ہوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچیے

ہے مشقِ وفا جانتے ہیں لغزشِ پا تک
اے شمع تجھے دعوے ثابت قدمی ہے؟

واماندۂ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں
اے حسرتِ بسیار تمنا کی کمی ہے

چمن زارِ تمنا ہو گیا صرفِ خزاں، لیکن
بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرت ناک باقی ہے
نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالب گردشِ افلاک باقی ہے

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

دریوزۂ سامانہا، اے بے سر و سامانی
ایجادِ گریبانہا، در پردۂ عریانی
پروازِ تپش رنگے، گلزارِ ہمہ تنگے
خوں ہو قفسِ دل میں اے ذوقِ پر افشانی
گلزارِ تمنا ہوں، گل چینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسد بلبل در بندِ زبانی

خرابِ نالۂ بلبل شہیدِ خندۂ گل!
ہنوز دعوئے تمکین و بیمِ رسوائی!
ہزار قافلۂ آرزو بیابان مرگ
ہنوز محملِ حسرت بدوشِ خود رائی!

وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا
اسدؔ ہنوز گمانِ غرورِ دانائی!

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

فسردگی میں ہے فریادِ بے دلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

پری بہ شیشہ و عکسِ رُخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشاطہ، خوں فشاں تجھ سے

طراوتِ سحر ایجادیِ اثر یک سو
بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے

چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس
اُمید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

نیازِ پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے

بہانہ جوئیِ رحمت، کمیں گرِ تقریب
وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

اسدؔ بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس
خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے

وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے

یک نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے اُن کو جو کہویں زندگانی مفت ہے

وہم طربِ ہستی، ایجاد سیہ مستی
تسکیں دہ صد محفل، یک ساغرِ خالی ہے

زندانِ تحمل ہیں، مہمانِ تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

اسد جاں نذرِ الطافے، کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو، حالِ دل پرسیدنی جانے
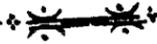
(رباعیات)

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا — ممکن نہیں یک زبان و یک دل ہونا
میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ — ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا

اے کاش! بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف — پہلوئے حیا سے گزر جاتا صاف
اک تسمہ لگا رہا کہ تا روئے چند — رہے ہے نہ مشقتِ گدائی سے معاف

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ — ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خوں و دعوتِ صد نشتر — یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

دل موزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج — نیرنگِ زمانہ فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفس ہیں جوں طنابِ صنّاع — ہر پارۂ دل برنگِ دیگر ہے آج

انتخاب اشعار از قصائد منقبت

ہے کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگِ ظہور
غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار

موجِ خمیازۂ یک نشہ، چہ اسلام و چہ کفر
کجیِ یک خطِ مسطر، چہ تو ہم چہ یقیں

قبلہ و ابروئے بت، یک رہِ خوابیدۂ شوق
کعبہ و بت کدہ یک محملِ خوابِ سنگیں

نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیّر، نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

بجز از نگاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا؟
کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی

نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تمیز جو ہے
چہ حسابِ جاں فشانی؟ چہ غرورِ دلستانی؟

چہ امید و ناامیدی؟ چہ نگاہ و بے نگاہی؟
ہمہ عرضِ ناشکیبی، ہمہ سازِ جاں ستانی

مجھے بادۂ طرب سے یہ خمار گاہ قسمت ؎
جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرانی

نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی
مجھے طاقت آزمائی، تجھے الفت آزمانی

یہ ہزار اُمید واری، رہی ایک اشک باری
نہ ہوا حصول زاری، بجز آستیں فشانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوان گفتگو پہ دل و جاں کی میہمانی

انتخاب کلام متفرق

(جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل نہیں ہے بلکہ دیگر ذرائع سے منظر عام پر آیا ہے)

ان دل فریبیوں سے نہ کیوں اُس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

(بیاض علائی)

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

(بیاض علائی)

چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

(مطبوعہ حسرت موہانی)

مستقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھے ورنہ
ہم کو اندازۂ آئینِ دفا ہو جاتا

(مطبوعہ آسی)

محشر آشوب ہوائی ہے اندازِ کرم
مجرموں کا دل نہیں رہتا پشیمانی بغیر
پائے بندِ عشق رسم دہر سے آزاد ہیں
کر رہے ہیں ذکر تیرا سبحہ گردانی بغیر

(مطبوعہ آسی)

بد تر از ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحن باغ
خانۂ بلبل بغیر از خندۂ گل ہے چراغ
ہاں بغیر از خواب مرگ آسودگی ممکن نہیں
رخت ہستی باندھ تا حاصل ہو دنیا سے فراغ

(مطبوعہ آسی)

ابر روتا ہے کہ بزم طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

(نسخہ شیرانی)

اپنا احوال دل زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرم اسرار کہوں یا نہ کہوں

شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں

اپنے دل ہی سے، میں، احوالِ گرفتاریٔ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں

دل کے ہاتھوں سے، کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز
گوش ہیں در پسِ دیوار کہوں یا نہ کہوں

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسد
حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

(دیوان معروف)

کہاں سے لا کے دکھائے گی عمر کم مایہ
یہ نصیب کو وہ دن کہ جس میں رات نہیں

خوشی خوشی کو نہ کہہ غم کو غم نہ جان اسد
قرار داخلِ اجزائے کائنات نہیں

(مطبوعہ آسی)

ہوں شمع، ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں
اور اس کے سوا کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

مت ہوجیو اے سیلِ فنا ان سے مقابل
جانبازِ الم نقش بہ دامانِ بقا ہیں

اے وہم طرازانِ مجازی و حقیقی
عشاق فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں

ہم بے خودیِ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے
یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں

اب منتظرِ شورِ قیامت نہیں غالبؔ
دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

(مطبوعہ آسی)

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن
از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ
میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں ہر چند ہوں ذلیل
پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(بیاضِ علائی)

وضعِ نیرنگیِ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

دشتِ وحشت میں نہ پایا کسی صورت سے سراغ
گردِ جولانِ جنوں تک نے پکارا ہم کو

عجز ہی اصل میں تھا حاملِ صد رنگ عروج
ذوقِ پستیِ مصیبت نے اُبھارا ہم کو

ضعف مشغول ہے بے کار بہ سعیِ بے جا
کر چکا جوششِ جنوں اب تو اشارا ہم کو

صورِ محشر کی صدا میں ہے فسونِ اُمید
خواہشِ زیست ہوئی آج دوبارا ہم کو

تختہ گورِ سفینے کے مماثل ہیں اسد
بحرِ غم کا نظر آتا ہے کنارا ہم کو

(مطبوعہ آسی)

حسن بے پروا، گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کمیں گاہِ نظر میں دل تماشائی نہ ہو

ہے محبت رہزنِ ناموسِ انساں لے اسد
قامتِ عاشق پہ کیوں ملبوسِ رسوائی نہ ہو

(مطبوعہ آسی)

نہ پوچھ حال اس انداز، اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آجائے گی جواب کے ساتھ
مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی
ملو رقیب سے، لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

(مطبوعۂ آسی)

دیکھ وہ برقِ تبسم، بس کہ دل بے تاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش
اب شکستِ توبہ مے خواروں کو فتح الباب ہے

(عمدہ منتخبہ)

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

(عمدہ منتخبہ)

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف برطرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

(نسخہ شیرانی)

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں انداز رسا رکھتے تھے
اُس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اُٹھا رکھتے تھے
زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

(از حمید الدین صاحب نظامی)

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

(عودِ ہندی)

دفا رِ ماتمِ شب زندہ دارِ ہجر رکھنا تھا
سپیدی صبحِ غم کی دوش پر رکھ کر کفن لائی
وفا دامن کشِ پیرایۂ ہستی ہے اے غالبؔ
کہ پھر نزہت گہِ غربت سے تا حدِ وطن لائی

(مطبوعہ آسی)

جوابِ جنتِ بزمِ نشاطِ جاناں ہے
مری نگاہ جو خوں نابہ بار ہوتی آئی ہے

(مطبوعہ آسی)

اس قدر بھی دلِ سوزاں کو نہ جان افسردہ
ابھی کچھ داغ تو اے شمع فروزاں ہوں گے

گردشِ بخت نے مایوس کیا ہے لیکن
اب بھی ہر گوشۂ دل میں کئی ارماں ہوں گے

باندھ کر عہدِ وفا اتنا تنفر ہے ہے
تجھ سے بے مہر کم اے عمر گریزاں ہوں گے

خوگرِ عیش نہیں ہیں ترے برگشتہ نصیب
ان کو دشوار ہیں وہ کام جو آساں ہوں گے

موت پھر زیست نہ ہو جائے یہ ڈر ہے غالب
وہ مری نعش پہ انگشت بدنداں ہوں گے

(مطبوعہ آسی)

نمائشِ پردہ دارِ طرزِ بیدادِ تغافل ہے
تسلی، جانِ بلبل کے لیے خندیدنِ گل ہے

نمودِ عالمِ اسباب کیا ہے؟ لفظِ بے معنی
کہ ہستی کی طرح مجھ کو عدم میں بھی تامل ہے

نہ رکھ پابندِ استغنا کو قیدی رسمِ عالم کا
ترا دستِ دعا بھی رخنہ اندازِ توکل ہے

نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو یادِ گلشن نے
یہ چاکِ پیرہن گویا جوابِ خندۂ گل ہے

ابھی دیوانگی کا راز کہہ سکتے ہیں ناصح سے
ابھی کچھ وقت ہے غالبؔ ابھی فصلِ گل و مل ہے

(مطبوعہ آسی)

بھولے ہوئے جو غم ہیں انھیں یاد کیجیے
تب جاکے اُن سے شکوۂ بیداد کیجیے

شاید کہ یاس باعثِ افشائے راز ہو
لطف و کرم بھی شاملِ بیداد کیجیے

بے گانۂ رسومِ جہاں ہے مذاقِ عشق
طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاد کیجیے

(مطبوعہ آسی)

شورِ نیرنگِ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ
ہم خوشی اکثر رہینِ ناخوشی کرتے رہے

رخصت اے تمکینِ آزارِ فراقِ ہم رہاں
ہو سکا جب تک غمِ واماندگی کرتے رہے

(مطبوعہ آسی)

درد ہو دل میں تو دوا کیجیے
دل ہی جب درد ہو تو کیا کیجیے

ہم کو فریاد کرنی آتی ہے
آپ سنتے نہیں تو کیا کیجیے

ان بتوں کو خدا سے کیا مطلب؟
توبہ توبہ خدا خدا کیجیے

رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی
پہلے دل درد آشنا کیجیے

عرضِ شوخی، نشاطِ عالم ہے — حسن کو اور خود نما کیجیے
دشمنی ہو چکی بہ قدرِ وفا — اب حقِ دوستی ادا کیجیے
موت آتی نہیں کہیں غالب — کب تک افسوس زیست کا کیجیے

(مطبوعہ آسی)

سکوت و خامشی اظہارِ حالِ بے زبانی ہے
کمین درد میں پوشیدہ رازِ شادمانی ہے
عیاں ہے حال و قالِ شیخ سے اندازِ دلچسپی
مگر رندِ قدح کش کا ابھی دورِ جوانی ہے؟

(مطبوعہ آسی)

کس کی برقِ شوخیِ رفتار کا دلدادہ ہے؟
ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے

(مطبوعہ آسی)

اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے
کیا طرفہ تمنا ہے، امید کرم تجھ سے
امیدِ نوازش میں کیوں جیتے ہیں ہم آخر؟
سہتے ہی نہیں کوئی جب درد و الم تجھ سے
وارفتگیِ دل ہے، یا دستِ تصرف ہے؟
ہیں اپنے تخیل میں دن رات بہم تجھ سے

غالب کی وفا کیشی اور تیری ستم رانی
مشہور زمانہ ہے، اب کیا کہیں ہم تجھ سے
(مطبوعہ آسی)

غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اُس نے
نہ سہی ہم سے پر اُس بت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اُسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
(دیوانِ غالب طاہر اڈیشن)

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی
تیرے کوچے کا ہے مائل، دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی
کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ؟
خلد بھی باغ ہے، خیر آب و ہوا اور سہی
کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی
(اردوئے معلّٰی)

کٹے تو شب کہیں کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے؟

نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے؟

(خطوط غالب)

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری؟
دوست جو ساتھ مرے تا لب ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ
ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں
لو وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے

دیدہ خونبار ہے مدت سے ولے آج، ندیم
دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

(دیوان غالب مرتبہ حسرت موہانی)

دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

(یادگار غالب)

انتخاب

(از قطعہ برائے نواب کلب علی خاں والیِ رام پور)

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک
رہا ہے زور سے ابر ستارہ بار برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پہ، اے ابر، بار بار برس
(مکاتیب غالب)

انتخاب

از قطعہ در مدح ابوالقاسم صاحب قاسم
و مرزا احمد بیگ صاحب طپاں

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک
وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک

ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک

گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں
مے کدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک

زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن
کشتۂ شوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک

جانِ وفا پرست کو ایک شمیمِ نوبہار
فرقِ ستیزہ مست کو ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شائبۂ ریا سے دور
کر کے دل و زباں کو، غالبِ خاکسار ایک
(متفرقات غالب)

انتخاب
دیوانِ غالب

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

کاوِ کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

سادگی و پرکاری بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہ لاشِ بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

سراپا رہن عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بہ قدرِ ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

منھ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منھ پر کھلا

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آب جو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پُرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

اب میں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب
دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو
آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ
عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عُریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط
تو ہو اور آپ بصد رنگِ گلستاں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن
دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا

دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ جائیں گے کیا

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں، دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں کھائیں گے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں — شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ — شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن — شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں — یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا
بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات — عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعوےٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے جو قطرہ کہ دریا نہ ہوا

کام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

بہ نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا
بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا

نہ مارا جان کر بے جرم قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا
یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا
مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں — آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیش دُنیا کا

ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مُو کام چشمِ بینا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

قطرۂ مے، بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا
خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

تنگیِ دل کا گلا کیا یہ وہ کافر دل ہے
کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالبؔ مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پہ کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام
رُخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا
نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا یعنی
پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی
کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی میں دل ہوں فریبِ وفاخوردگاں کا

تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا
اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے
خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لیے ہوئے
ہوں شمعِ کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں
شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں
حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

رشک کہتا ہے کہ اُس کا غیر سے اخلاص حیف
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلےٰ آشنا

ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر جو تھا رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہوا منظور اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہوا غالبؔ دشمن آسماں اپنا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے
شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُر گل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جور سے باز آئیں پر باز آئیں کیا — کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ — جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے — آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ — مر گئے پر دیکھیے دکھلائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

(ب)

پوچھ مت وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہُما موجِ شراب

(ت)

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر
کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

چشمِ ما روشن کہ اُس بے درد کا دل شاد ہے
دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

(د)

حسنِ غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا
ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی
اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

(س)

نہ کہہ کسی سے کہ غالب نہیں زمانہ میں
حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر
جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر
چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہو گا
قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

نہ لڑ، ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہرچند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا
ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی
بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالبؔ
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

(ز)

نہ پوچھ وسعتِ مے خانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز — میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائشِ خمِ کاکل — میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
ہوں گرفتارِ اُلفتِ صیاد — ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خوں — جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا — اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

(س)

مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے
دامِ خالی قفسِ مُرغِ گرفتار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے
دُشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
مر گیا پھوڑ کے سر غالبؔ وحشی ہے ہے
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

(ف)

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے
اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف

(ک)

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل
گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

(گ)

گر تجھ کو ہے یقین اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دل بے مدعا نہ مانگ
آتا ہے داغ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

(ل)

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

(م)

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم

(ن)

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے
ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیِ خیال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالب
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اُس گُل کی کہ گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اُس کے گھر کے دیواروں کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

بسکہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گُل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

غرّۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا
پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
جاں ہے بہائے بوسہ دے کیوں کہے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پانوں میں زنجیر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں
غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قولِ ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

عشق تاثیر سے نومید نہیں
جاں سپاری شجر بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے
جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکرِ وفا ہو فریب اُس پہ کیا چلے
کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

مَیں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے
ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لئے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوتراب میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ تری رہ گزر کو میں

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا
سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفیٔ منصور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو
تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں
ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریِ یارانِ وطن یاد نہیں

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہ گزارِ باد یاں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل مست کب بند قبا باندھتے ہیں
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالب ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں
زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں
یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں
حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

اُن پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہوگئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صَرفِ درباں ہوگئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے روکشی — حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا — لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا — دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے

جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

اسد زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں

خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں — سوائے خونِ جگر سو جگر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد — کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں

بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیم روز

آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

حُسن اور اُس پہ حُسنِ ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں

واں وہ غرورِ عزّ و ناز یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بُلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں مُنہ سے مجھے بتا کہ یوں

پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھیے
سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی
سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشک فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اُسے سُنا کہ یوں

(۹)

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشا ہو
کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے خوف فرصتِ ہستی کا غم کوئی
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نواسنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں نہ ہو یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پر
کیا سینہ میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو

خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا نگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال
کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

بدلیں

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں

سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو

نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا

تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے

نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رُسوائی

بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

(۵)

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ
جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہم رہاں نہ پوچھ

(ی)

صد جلوہ رو بہ رو ہے جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں جو دید کا احساں اٹھائیے

دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم
اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے

یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے
یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی
ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے

مے سے غرض نشاط ہے کس رو سیاہ کو
یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگ لالہ و گل نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خم پہ چاہیے ہنگام بیخودی
رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مست مے ذات چاہیے

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رہتا ہے باندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

خیالِ مرگ کب تسکینِ دل آزردہ کو بخشے
مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

نہ اتنا برشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ
مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

ہے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ہے بزمِ بُتاں میں سخن آزردہ لبوں سے
تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا
یک بار لگا دو خُمِ مے میرے لبوں سے
رندانِ درِ مے کدہ گُستاخ ہیں زاہد
زنہار نہ ہونا طرفِ ان بے ادبوں سے

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے
ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

اُنھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

لکد کوبِ حوادث کا تحمّل کر نہیں سکتی
مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی
دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مُور آسمان ہے

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے

ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر
غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ
تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے

کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال
دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی
یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری ہائے ہائے

گلفشانیہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی
اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے

ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے

گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال
ایک دل تس پہ یہ نا اُمیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا
ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں
ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ
جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

خزاں کیا فصلِ گُل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنّا ہے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
میری وحشت تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبّت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

عمر ہر چند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں
نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی

کچھ تو دے اے فلکِ نا انصاف
آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

ڈھونڈے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے

رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے
مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے

بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

غالب تمھیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا
جوشِ بہار جلوے کو جس کی نقاب ہے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اُتنا ہی کھنچتا جائے ہے

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گل کا تصوّر میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کس کس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ نا اُمیدی خاک میں مل جائے گی
یہ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے
اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فتنۂ شورِ قیامت کس کے آب و گِل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا
مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

ختم شد

مکتبۂ اشاعتِ اسلامیہ دہلی